عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوع اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

نومبر ۱۹۳۸

ایک روپیہ

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

رام باغ روڈ

کراچی

مرتّبہ

محمد یونس

بدلِ اشتراک

سالانہ — دس روپے

ششماہی — چھ روپے

خروج رجسٹری سالانہ — دو روپے چار آنے

جلد ۱ نمبر ۱۱

قیمت فی پرچہ — ایک روپیہ

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ
محبوب الٰہی		۱
جنات و اقبال (نظم)	اسد ملتانی	۲
لمعات		۳
بقیہ لمعات صفحہ ۱۶ سے آگے		۴۷
عالم اسلامی میں حج کی اہمیت	(جناب پرویز)	۱۷
انجمن افلاک (نظم)	جناب عرشی	۲۲
باب المراسلات		۲۵
نماز		..
قربانی		..
غلام اور لونڈیاں		..
دورنگی		۳۸
مہاجرین کا مستقبل		۴۳
پاکستان کے افسر		۴۹
نقد و نظر		۵۱
بقیہ نقد و نظر		۶۲
اسلام کا نظریۂ جہاد	(حکیم حیدزمان صدیقی)	۵۲
ہندوستانی سیاست کا تجزیہ		۶۳

محبوبِ الٰہی

کہتے ہیں دنیا میں ہر منٹ پر ایک موت واقع ہو جاتی ہے، لیکن بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے دلوں کی بستیاں ویران اور محبت کی محفلیں سونی ہو جاتی ہیں۔ خلوص ان کا تعزیت دار اور مہر و وفا ان کی ماتم گسار ہوتی ہے۔ صدہا قلوب ان کی یاد میں مضطرب و بیقرار اور ہزاروں آنکھیں ان کے غم میں اشکبار رہتی ہیں

میری آنکھیں آج ایک ایسی ہی موت کی یاد میں شبنم فشاں ہیں۔

دنیا نے عام طور پر شیخ محبوب الٰہی کو ایک انکم ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے جانا۔ لیکن جس کسی نے اس آب و گل کے پیکر کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا اسے ایک ایسا دل درد آشنا نظر آیا جو ہر وقت غمِ ملت میں غلطاں و پیچاں اور ہمیشہ بہبودیٔ قوم کے فکر میں جتباں و رقصاں رہتا تھا۔ مجھے اس طویل عرصہ کی ملاقات میں کوئی وقت ایسا یاد نہیں پڑتا کہ وہ ملے ہوں اور موضوعِ گفتگو مسلمانوں کے احوال و کوائف کے علاوہ کوئی اور بھی رہا ہو۔

۲۵ر اکتوبر کو اچھے بھلے کوئٹہ گئے اور ۳۰ر کی شام جب مجھے ان کے خط کا انتظار تھا، ان کی لاش پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔

محبوب! تمہاری موت سے جو خلا رونما ہو گیا ہے، وہ اب پُر نہیں ہوگا۔ تمہاری بے لوث محبت اور بے پایاں خلوص، اس حقیقت کی زندہ شہادت تھے کہ جو رشتہ قلب و نگاہ کی یک رنگی و ہم آہنگی پر استوار ہو وہ خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ محکم اور پائیدار ہوتا ہے۔

دل تیرے غم میں خوں فشاں اور آنکھیں تیری یاد میں اشکبار ہیں۔ لیکن ایک دُور کی بے صوت صدا، جگر کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یہ کہکر جوڑ دیتی ہے کہ

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

اے دوست! خدا کی رحمتیں تجھ پر سایہ فگن ہوں اور اس کے جود و عطا کی نسیمِ جنت تیری روح کو آسودگی بخشے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

جگر فگار
پرویز

جناح — و — اقبال

قائدِ اعظم جونہی فردوس میں داخل ہوئے
حضرتِ اقبال آئے اُن کے استقبال کو

قائدِ اعظم نے ملتے ہی بغل گیری کے بعد
کامیابی پر مبارک باد دی اقبال کو

سُن کے یہ اقبال بولے، آفریں ہو آپ پر
آپ ہی نے کر دکھایا حال میرے قال کو

میں نے تو ظاہر کیا تھا اک خیال اور آپ نے
جامۂ تفصیل پہنایا مرے اجمال کو

آپ کی عقلِ جنوں پرور کا اعجاز تھا
رفع کرنا دوست اور دشمن کے ہر اشکال کو

کامیابی سے نوازا ہے خدائے پاک نے
آپ کے صدق و خلوص و عزم و استقلال کو

آپ نے تو کر دیا بے شبہ فرض اپنا ادا
دیکھنا ہے اب مسلماں کے مقام و حال کو

توڑ پھینکا اُس نے افرنگی کا ذہنی دام بھی
یا ابھی چھوڑا ہے صرف اُس کے سیاسی جال کو

کاش یہ اللہ کے حبلِ متیں کو تھام لے
چھوڑ کر افرنگ کے بازیچۂ اطفال کو

رکھ کے یہ قرآن و سنت کو نظر کے سامنے
لائے اس معیار پر افکار اور اعمال کو

جلد پاکستان میں جاری ہو اسلامی نظام
تاکہ اطمینان حاصل ہو دلِ اقبال کو

اسد ملتانی

لمعات

بارھا گفتہ ام و بار دگر می گویم

دنیا میں بعض مصیبتیں انسان پر ہنگامی حوادث کی وجہ سے آتی ہیں جن پر اسے قدرت نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے بسا اوقات ان کے نتائج و عواقب کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان اپنے لئے آپ پیدا کر لیتا ہے اور اس طرح خواہ مخواہ اپنی خودساختہ پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد، جو مصائب و نوازل اس کے دشمنوں کے مشئومہ عزائم کے پیدا کردہ تھے، یا جو حوادث ارضی و سماوی کے ہاتھوں رونما ہوئے، وہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ لیکن ان سے کہیں زیادہ مہیب و شدید ہماری خودساختہ مشکلات ہیں جن میں ہم اس بُری طرح سے گھرے ہیں کہ ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ان خودساختہ مصائب میں سب سے بڑا ہوّا وہ ہے جو "نظامِ شریعت" کی شکل میں اعصابِ ملت پر سوار ہے اور جس سے کوئی راہ مفر نظر نہیں آتی۔ ایک مسلمان کے لئے یہ سوال ہی مضحکہ انگیز ہے کہ وہ شریعت کے نظام پر چلنا چاہتا ہے یا غیر شرعی آئین کے تابع۔ انگریزی غلامی میں دیوانی مقدمات میں فریقین میں سے جب کوئی یہ کہتا کہ میں اپنا فیصلہ شریعت کے مطابق نہیں بلکہ رواج کی رُو سے چاہتا ہوں تو سینہ میں دل اور دل میں ایمان کی رمق رکھنے والے طبقہ میں اس کی یہ حرکت سخت مذموم قرار پاتی۔ اس وقت عام طور پر کہا جاتا تھا کہ جن معاملات میں ہمیں اختیار نہیں ان میں تو خیر بے بسی ہے۔ لیکن جن صورتوں میں فیصلہ ہمارے اختیار پر چھوڑا جاتا ہے ان میں رواج کو شریعت پر ترجیح دینا اپنے کلمہ شہادت کی عملی تکذیب ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی تحریک آزادی سے مقصود ہی یہ تھا کہ جن امور میں انہیں اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ شریعت کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلہ کرا سکیں، ان امور میں بھی انہیں یہ اختیار مل جائے حتیٰ یکون الدین کلہ للہ

چنانچہ یہ اختیار حصول پاکستان کے بعد مل گیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

لہٰذا اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہونا چاہیئے۔ یہی وہ حقیقت تھی کہ جس کی طرف قلبِ ملت، محترم قائداعظم مرحوم نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی کے ایک اجتماع میں ان الفاظ میں اشارہ فرمایا تھا کہ:-

میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے، کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں۔۔۔ اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا یہ اصول آج بھی اسی طرح کار آمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پیشتر تھے۔ (ڈان ۱/۲ ۲۵)

اسی حقیقت کو محترم لیاقت علی خاں نے پشاور کے ایک اجتماع کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعۂ ارض حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔۔۔۔۔ پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی اسٹیٹ ہوگی جس میں عدل و انصاف اور مساوات کے اسلامی اصولوں کا نفاذ ہوگا اور طبقاتی امتیاز ختم کر دیا جائے گا۔ پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہوگی اور ہم دنیا کو دکھا سکیں گے کہ تیرہ سو سال پہلے کے اصول آج بھی کار آمد ہو سکتے ہیں۔

(ڈان۔ ۱۳، ۱۴ جنوری ۱۹۴۸ء)

کرنے کا کام یہ تھا کہ اس اصول کو پاکستان کی مجلس آئین ساز کی وساطت سے ایک آئینی منشور کی شکل دے کر یہ اعلان کر دیا جاتا، کہ چونکہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اس لئے اس کا نظام حکومت بھی لامحالہ اسلامی ہوگا۔ اور اس کے بعد اس نظام کی تدوین و ترتیب کے لئے عملی قدم اٹھایا جاتا۔ لیکن ہمارے ارباب بست و کشاد نے ایسا نہ کیا اور اس طرح اپنے ہاتھوں ایک ایسی مصیبت پیدا کر لی جس سے اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں (اور ہو رہی ہیں) کہ جوں جوں انہیں سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں۔ سب سے بڑی الجھن یہ کہ اس سے ان تخریبی عناصر کو جو شروع ہی سے پاکستان کے خلاف چلے آتے تھے اور تشکیل پاکستان کے بعد اس کی تخریب کے منحوس ارادے مقدس نقابوں میں چھپائے ہوئے تھے، عوام کے دلوں میں ظنون و وساوس پیدا کرنے کا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ اور انہوں نے اس طرح امید اور یقین کی ان مستحکم بنیادوں کو جن پر اس "اسلامی تجربہ گاہ" کا قصر رشید و رفیع المنزلت استوار ہونا تھا، شکوک و تذبذب، بدظنی اور بداعتمادی اور یاس و نا امیدی کے مہلک جراثیم سے متزلزل کر دیا۔ اس سے پاکستان کو ایسا دور رس اور مہلک نقصان پہنچا ہے، جس کا سطحی نگاہوں سے اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مذہب کا جذبہ، عام مسلمانوں کے تحت الشعور میں جاگزیں ہے۔ اس کی اصل اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اس گئے گزرے زمانہ اور افسردہ دور میں بھی اس کے عروق مردہ میں خون زندگی دوڑانے کا سب سے بڑا محرک یہی جذبہ ہے۔ دنیا نے اپنی اپنی قوموں کے لئے وطن، قوم، تاج، مملکت کی محبت و عقیدت کے جذبات کو وجۂ گرمیٔ خون اور باعث "تخلیق جنون" بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مسلمان کے لئے ان میں سے کوئی جذبہ بھی ایسا مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہوا جس قدر ایک اللہ کا نام انقلاب آفریں ثابت ہوا ہے۔ وہ اس نام کی بلندی کے استحکام اور اس کی آبرو کے قیام کے لئے اپنی عزیز ترین متاع جنت کھیلتے لٹا دیتا ہے۔ اس کے اس بے پناہ جذبۂ شوق

جنون کو شکوک و ظنون کے دق کے جراثیم کے سپرد کر دینا، ملّی خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟

مندرجہ صدر وجوہات کی بنا پر، اس مسئلہ کے متعلق ایک واضح، مبین اور غیر مبہم، سرکاری اور آئینی اعلان کی ضرورت پہلے ہی کچھ کم نہ تھی لیکن پچھلے دنوں سے ہندوؤں کی طرف سے جو خاص پروپیگنڈہ شروع ہوا ہے اس کے پیشِ نظر یہ ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس موقع کے آخری لمحات آ پہنچے ہیں جب اس باب میں حکومتِ پاکستان کے اربابِ حل و عقد کو بلا تاخیر مزید، فیصلہ کرنا ہوگا۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے ہائی کمشنر مقیم پاکستان نے مشرقی بنگال کے حالات و کوائف کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ وہاں کے ہندو اس لئے ہندوستان آ رہے ہیں کہ ارکانِ پاکستان نے کئی مرتبہ اعلان کیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہوگی۔ لہٰذا اس قسم کی اسٹیٹ میں غیر مسلم کس طرح اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں؟ اس کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل، محترم خواجہ ناظم الدین نے جب ایک بیان کے سلسلہ میں فرمایا کہ محترم قائدِ اعظم کی وفات کے بعد ہمارے اندرونی اختلافات دور ہو چکے ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے قدیم شریعت کی فوری تنفیذ کا مطالبہ کیا کرتے تھے، انہوں نے بھی اپنی جد و جہد کو ملتوی کر دیا ہے، تو اس پر ہندوستان ٹائمز نے "نسیم سحری" کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس میں کہا کہ۔۔

> پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال، کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہ نماؤں نے متعدد بار، اس کا اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں، اسلامی اصول و روایات کے مطابق، ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اور اس کے بعد لکھا کہ

> اگر کشمیر کا تنازعہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائیگا۔ (۱۰ ستمبر)

پھر جب لندن میں محترم لیاقت علی خاں نے ایک اجتماع میں کہا کہ

> پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائیگی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ ہندوستان ٹائمز (۲۵ ستمبر)

تو اس پر اس اخبار نے پھر اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ

> تقسیمِ ہند کے وقت سے، ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں لادینی (Secular) مملکت ہوگی۔ لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں

> اور ارکان حکومت کی تمام کوششیں اس امر میں صرف ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو یقین دلائیں کہ وہ یہاں بالکل محفوظ ہیں پاکستان کی اقلیتوں کو محسوس کرایا جا رہا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لئے کوئی جگہ نہیں اور ان کی املاک کو قانوناً ضبط کیا جا سکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خاں نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔ (صفحہ ۲۰)

یہ وہی پراپیگنڈہ ہے جو اس سے بہت پہلے عیسائی حکومتوں اور مشنریوں نے مسلمانوں کے خلاف شروع کیا تھا اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمان، ساری دنیا کی نگاہوں میں سب سے زیادہ وحشی، خونخوار، انسانیت کا دشمن اور تہذیب و تمدن کا عنصر قرار پا چکا ہے جس کے ہاتھوں نہ کسی شریف آدمی کی عزت محفوظ ہے نہ آبرو، نہ جان سلامت ہے نہ ایمان۔ اس کا مذہب دنیا میں فساد اور خونریزی کا سب سے بڑا موجب اور اس کی شریعت ننگ و ناموس انسانیت کی سب سے عجیب دشمن ہے۔ چنانچہ آج بھی صورت یہ ہے کہ جب ہم اقوام عالم کے کسی اجتماع میں جاتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ ہم سے ڈریئے نہیں ہم انسان ہی ہیں، خونخوار درندے نہیں ہیں۔ یہ تو رہی ہماری تصویر غیروں کی نگاہ میں اور خود اپنوں کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ بھی رفتہ رفتہ اس پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر محسوس (اور بعض اوقات اس امر کا کھلے بندوں اقرار) کرنے لگ گئے کہ اسلام کا نظام واقعی چودہ سو سال پیشتر کے اکھڑ بدوؤں کو درست کرنے کے لئے موزوں تھا، آج کی مہذب دنیا میں اس سکہ کا چلن ناممکن ہے۔ اس غلط پروپیگنڈہ کا اثر خدا خدا کر کے زائل ہونے لگا تھا کہ اب ہندوؤں کی طرف سے اس کی تجدید شروع ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے ارباب حل و عقد جو پہلے ہی کچھ بین بین مسلک کے عادی ہیں۔ ڈرنے لگ جائیں گے کہ اگر ہم نے پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دے دیا اور اس میں نظام شریعت کو رائج کر دیا تو

(۱) دنیا ہمیں پھر وحشی اور غیر مہذب سمجھنے لگ جائے گی۔

(۲) یہاں کی اقلیتیں بدک کر بھاگنا شروع کر دیں گی۔ اور

(۳) اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کا ہندو انتقام پر اتر آئے گا۔

ان کا یہ ڈر بجا ہو گا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ہم نے یہ کیا کہہ دیا کہ ان کا یہ ڈر بجا ہو گا۔ ہاں نہ صرف ان کا یہ ڈر، بلکہ ایک حد تک وہ پروپیگنڈہ بھی جو مسلمانوں کے نظام حکومت کے خلاف دنیا کرتی چلی آئی ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔ جیسا کہ ہم بار بار بالوضاحت بیان کر چکے ہیں، مسلمانوں کا (اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا) نظام مملکت و آئین شریعت، اپنے اکثر و بیشتر حصوں میں ایسا ہی رہا ہے جسے ہم دنیا کے سامنے کبھی فخر کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک مثال اسی پرچہ کے باب المراسلات میں "لونڈی اور غلاموں" کے عنوان کے تحت دیکھئے۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، نظام شریعت کے سب سے بڑے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں وہ جس قسم کا "شرعی نظام"

رائج کرنا چاہتے ہیں ؛ اسے دیکھ کر دنیا کی قومیں آپ خود کہ متعلق کیا کہیں گی اور جو کچھ کہیں گی اس میں حق بجانب ہوں گی یا نہیں ؟ یہ نمونہ ہے اس نظام شریعت کا جو مسلمانوں کے دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوا لیکن جسے شومئی قسمت سے مسلمان اسلامی نظام سمجھ رہا ہے ۔

تو پھر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اعلان کر دیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ نہیں ہوگی بلکہ لادینی اسٹیٹ ہوگی ؟ یہ نہیں ۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو ہندوستان کی تقسیم کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف ہم گزشتہ اشاعت کے لمعات میں اشارہ کر چکے ہیں ۔ یعنی یہ کہ

(۱) پورے حتم ویقین اور وثوق واعتماد سے اعلان کر دیا جائے کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگی ۔

(۲) اس اسٹیٹ کا نظام قرآن پر مبنی ہوگا ۔

اور اس کے بعد، حکومت ہند سے یہ کہا جائے کہ پاکستان کے اسلامی اسٹیٹ بننے سے آپ کو غیر مسلموں کے بارے میں جو خدشات وخطرات نظر آ رہے ہیں ، ان کی ایک تفصیلی فہرست مرتب کر کے بھیج دیجئے اور اس کے بعد دیکھ لیجئے کہ جو قانون ہم بناتے ہیں ، اس فہرست میں سے کسی ایک خطرہ یا خدشہ کا اندیشہ بھی باقی رہتا ہے ؟ اُن سے کہہ دیجئے کہ ہم اپنا قانون اس وقت ... رائج کریں گے جب آپ خود دیکھ لیں گے کہ آپ کے تمام خطرات وخدشات وہمی ہیں ۔ ان میں سے ایک بھی مبنی بر حقیقت نہیں ۔ اور اتنا ہی نہیں ۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھئے اور ان سے کہئے کہ اس کے بعد ہمارے قانون کا اپنے قانون سے موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق ومفاد کا جس طرح قانونی تحفظ ہم کرتے ہیں اور جو جو مراعات انہیں ہم دیتے ہیں کیا آپ کا قانون اس کی نظیر پیش کر سکتا ہے ؟

اور آگے بڑھئے اور ساری دنیا کو کہہ دیجئے کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۔ اس قانون کی کسی ایک شق کی نظیر اپنے ضوابط قوانین سے پیش کر کے بتاؤ ۔ جسے ہم پیش کرتے ہیں وہ خدا کا قانون ہے مذاق نہیں ہے اگر وہ انسانوں میں عدل ومساوات قائم نہ رکھ سکے تو اسے خدائی قانون کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ۔ خدا کا قانون نہ ہوا اشنوکاشستر یا ایشلانٹک چارٹر ہوا ۔

کھیل بچوں کا ہوا ، دیدۂ بینا نہ ہوا !

اور پھر اس کے بعد ، چھوٹے منہ سے بڑی بات کہنے کی بھی اجازت دیجئے ۔ وہ بات جو ہزار بار ہمارے عمق قلب سے اٹھی لیکن زبان تک آتے آتے رک گئی یعنی یہ کہ شکوک وشبہات اور خطرات وخدشات کی جو فہرست غیر مسلم بھیجیں ، اگر اور کسی صورت میں اس کا جواب مشکل نظر آئے تو اسے قانونِ خداوندی کے ان ادنیٰ خدام کے پاس بھیج دیجئے اور پھر دیکھ لیجئے کہ جو دعویٰ اوپر کیا گیا ہے وہ حرف بحرف درست ثابت ہوتا ہے یا نہیں ۔ یہ وہ انانیت نہیں جو اکثر رات دماغی کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ خدا کے قانون کی عالمگیریت اور بے مثالیت پر اس ایمان ویقین کا مضطربانہ مظاہرہ ہے جو انسان کے سامنے اس حقیقت کبریٰ کو واشگاف کر دیتا ہے کہ انسانی فطرت کا ترجمان ، قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں اور

ارتقائے شرفِ انسانیت کے لئے یہی واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ اس حمیت کی بے غیرتانہ جھلک ہے جو کبھی اس ذلت کو گوارا نہیں کرسکتی کہ باطل کی ابلہ فریبیاں خدا کے نازل کردہ آئینِ حیات کو اس طرح وجۂ فسادِ آدمیت قرار دیں اور اس کتاب پر ایمان رکھنے والے اسے خاموشی سے سنا کریں۔ بلے بھاری نہیں۔ قرآن کی تحدی سمجھئے جسے وہ ساری دنیا کے سامنے علی الاعلان پیش کرتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مسلمان بھول چکا ہے کہ وہ کس قدر بے بہا متاعِ بے مثال کا مالک ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک گداگر کی طرح ہر دھتکارنے والے کی جھڑکیاں سہتا ہے اور اونچی آواز سے چلانے والے سے ڈر کر سہم جاتا ہے۔ اسے کس طرح بتایا جائے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے؟ اسے کون سمجھائے کہ

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

پاکستان کے مسلمانوں کو، ہندوؤں کے اس باطل افروز چیلنج کو ذلت کی خاموشی سے نہیں سن لینا چاہیئے بلکہ قانونِ خداوندی کے عملی نفاذ سے اسے جھٹلا دینا چاہیئے اور اس طرح دنیا کو بتا دینا چاہیئے کہ یہ ہے وہ مسلکِ حیات جسے وجۂ ننگِ انسانیت ٹھہرایا جاتا تھا۔

~~~~ ۞ ~~~~

محترم خواجہ ناظم الدین صاحب نے اپنے محولہ بیان میں فرمایا ہے کہ

جو لوگ قدیم (Orthodox) نظام شریعت کی فوری (Immediate) ترویج کا مطالبہ کرتے تھے انہوں نے بھی اپنی مساعی کو ملتوی کر دیا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ محترم خواجہ صاحب پاکستان میں قانونِ اسلامی کی تنفیذ کے خلاف نہیں ہیں (جیسا کہ ہندوستان ٹائمز نے اس سے نتیجہ نکالا ہے) بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ

(۱) اسلامی قانون ہمارے حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیئے۔ اور

(۲) اسے بتدریج رائج کرنا چاہیئے۔

ہم شروع سے یہی کہتے چلے آرہے ہیں۔ وہ نظامِ اسلامی جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے اسی صورت میں مرتب ہوسکتا ہے کہ قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی جزئیات، اپنے حالات کے مطابق متعین کی جائیں۔ یہ صلاحیت صرف قرآن میں ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی قیامت تک کی ضروریات کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو نظام بھی ہے انسانوں کا خود ساختہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے جو نظام کسی ایک زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھکر مرتب کیا ہو (خواہ وہ جزئیات قرآنی اصولوں کی روشنی میں کیوں نہ متعین کی گئی ہوں) وہ ابدالآباد تک غیر متبدل نہیں رہ سکتیں۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ ماہ لکھا تھا، اربابِ حکومت کو اس باب میں اغلباً یہ اندیشہ ہے کہ قدامت پرست حضرات اس کی مخالفت کریں گے اور عوام کے جذبات کو مشتعل کردیں گے۔ لیکن اس اندیشہ کا علاج تاخیر نہیں ہے
~~~~

اس سے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہمیں اپنے حالات کے مطابق خود اپنی جزئیات متعین کرنی ہیں تو عزم راسخ سے اس کا اعلان کیجئے کہ ہمارے آئین کی بنیاد قرآن پر ہوگی۔ اور پھر پوچھئے مسلمانان پاکستان سے کہ کسی کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ وہ کون بدبخت مسلمان ہے جو یہ کہے گا کہ ہمارے آئین کی بنیاد قرآن پر نہیں ہونی چاہیئے۔ اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو اس نظام کے ساتھ کس درجہ والہانہ عقیدت پیدا ہو جاتی ہے؟ یہ خدشات و خطرات سب اس لئے ہیں کہ آپ حقائق کا سامنا کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ حقائق کو بے نقاب سامنے رکھئے۔ یہ تمام خدشات کافور ہو جائیں گے کہ ان الباطل کان زھوقا

باقی رہا اس کا تدریجی نفاذ تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام تدریجی اور مہالی طور پر ہی رائج ہو سکتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، تدریجی مراحل تو کسی نقطۂ آغاز سے شروع ہوں گے۔ اگر آپ کسی پروگرام کی ابتدا ہی نہ کریں گے تو وہ اپنے تدریجی منازل طے کس طرح سے کرے گا؟ برس دن سے یہ قوم سنتی چلی آ رہی ہے کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہے۔ اس کا آئین اسلامی اصولوں کے مطابق ہوگا۔ لیکن آج تک اس باب میں ایک عملی قدم بھی تو نہیں اٹھایا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری حکومت کے سامنے بڑے بڑے اہم مسائل ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بیرونی خطرات ان کی تمام توجہات کو اپنی طرف مرکوز اور تمام قوتوں کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر بیرونی خطرات کا تدارک اور حفاظتی تدابیر استحکام پاکستان کے لئے ضروری ہیں تو اندرون ملک میں آئینی نظام کی ترتیب و تنفیذ بھی استحکام پاکستان کے لئے کچھ کم ضروری نہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ہمارے معاملات منشائے خداوندی کے مطابق طے پائیں گے بلکہ قوم اس ذہنی خلفشار سے نجات حاصل کر کے جس میں وہ آجکل مبتلا ہے کامل جمعیت خاطر سے استحکام پاکستان کیلئے تیار ہو جائے گی اور ان تخریبی عناصر کو بھی زہر افشانی کا موقع نہیں ملے گا جو اس باب میں تاخیر یا عدم فیصلہ کی آڑ لیکر قوم میں تشتت و انتشار اور بد دلی اور بد گمانی پیدا کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

محترم خواجہ ناظم الدین نے اپنے بیان میں فرمایا ہے کہ جو لوگ پہلے قدیم شرعی نظام کی تنفیذ کا مطالبہ کرتے تھے انہوں نے بھی اب اپنی جد و جہد کو ملتوی کر دیا ہے اور حکومت کی تائید اور امداد کا وعدہ کر لیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے خواجہ صاحب کا اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے لیکن اگر ان کے پیش نظر وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو اسلامی جماعت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے التوائے سعی سے مقصود وہی وہ اعلانات جو اس جماعت کی طرف سے، ان کے امیر اور معتمد کی گرفتاری کے بعد صادر ہوئے ہیں۔ تو ہم گزارش کریں گے کہ ان کی اتنی سی بات سے مطمئن ہو جانا اور سمجھ لینا کہ قوم کی ان کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس پر ابھی تک غور نہیں کیا کہ یہ تحریک جو بظاہر اسلامی جماعت کے مقدس اور معصوم نقاب میں سامنے آئی ہے اور جس کا مقصود اور مطالبہ مسلمانوں کو

سچے معنوں میں مسلمان بنانا بنایا جاتا ہے۔ کن محرکات پر مبنی، کن عوامل پر مشتمل ہے اور مستقبل میں کتنے بڑے فتنہ کا موجب بن سکتی ہے[1]۔ اصل یہ ہے کہ مدت ہائے دراز کے ذہنی جمود اور فکری خمود کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑی "سطح پسندی" آگئی ہے۔ وہ کسی معاملہ، مسئلہ یا تحریک کا بوقت نظر سے مطالعہ نہیں کرتے کہ ایسے مطالعہ کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کی سطح پر نگاہ ڈال لیتے ہیں اور اسی سے اس کی اصل کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتے ہیں اور پھر اس رائے پر اس شدت اور تعصب سے جم جاتے ہیں گویا وہ گہرے غور و فکر اور کامل بصیرت و فراست کے بعد قائم کی گئی تھی۔

ذرا سوچئے۔ آج سے قریب پچاس سال پہلے سرزمین پنجاب سے ایک تحریک اٹھی۔ بانیٔ تحریک نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے مصلح مشفق اور طبیب دردمند، اور اسلام کے بہت بڑے بہی خواہ کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اپنی تعارفی تصنیف براہین احمدیہ کے متعلق بتایا کہ وہ ایک سپر ہوگی۔ ان تمام اعتراضات کے لئے جو معاندین اسلام کی طرف سے اسلام پر وارد کئے جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں آریہ، پنڈت اور عیسائی مشنری مسلمانوں کے خلاف میدانِ تبلیغ گرم رکھا کرتے تھے، اس لئے اسلام کی حفاظت کے سلسلہ میں ان ہی گروہوں کو پیش پیش رکھا گیا۔ سادہ لوح مسلمان نے اس دعوت پر بے تابانہ لبیک کہا اور اس کے داعی کی ہر ممکن مدد اور تائید کے لئے چاروں طرف سے آوازیں بلند ہو گئیں۔ ان مقدس دعاوی کے ساتھ اس تحریک کی ابتدا ہوئی اور کسی نے اتنا سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ اس سے مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انگریز کو مسلمان کے جذبۂ جہاد سے جو خوف لاحق ہو رہا تھا وہ کسی طرح اس سے مامون ہو جائے۔ اس خطرہ کو وہ ہندوستان میں حضرت سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کی صورت میں اپنے سامنے دیکھ چکا تھا، اور جانتا تھا کہ اگر یہ تحریک دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے لئے ہندوستان تو ایک طرف، مشرق بھر میں قدم جمانے ناممکن ہو جائیں گے۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے اس جذبہ کو نکال دیا جائے اور ان کی توجہات اس طرح کسی دوسری طرف منتقل کر دی جائیں کہ انہیں ان کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے۔ یہ تحریک بڑی کامیاب رہی۔ اس نے ایک طرف جہاد کو حرام قرار دیا اور دوسری طرف پچاس برس تک مسلمانوں کو ان بحثوں میں الجھائے رکھا کہ

ابن مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے۔

یا "خاتم النبیین" میں خاتم کی ت مکسور ہے یا مفتوح۔ اور انگریز، ہندوؤں کو ساتھ ملا کر، نہایت اطمینان اور فراغت سے مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے سامان فراہم کرتا رہا۔ چونکہ اس تحریک کے پاس کوئی ایجابی (Positive) چیز پیش کرنے کو تھی نہیں اس لئے اس نے اپنی بنیاد منافرت کے سلبی (Negative) اسلوب پر رکھی۔ آپ دیکھیں گے کہ جونہی کوئی شخص مرزائیت کی بیعت کرتا ہے، باقی مسلمانوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے۔

---

[1] اسلامی جماعت کے ماعلیہ اور ما لہ کے متعلق تفصیلی گفتگو اس طرح ضمنی طور پر نہیں کی جا سکتی۔ اسے ہم کسی فرصت کے وقت پر اٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس وقت صرف معاملہ پیش نظر کے ضمن میں ہی بات کی جا سکے گی۔

وہ انہیں مسلمان ہی نہیں سمجھتا۔ وہ ان سب کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے اور صرف اپنی جماعت کو نجات یافتہ سمجھتا ہے۔ اگر اس نے آج بیعت کی ہے تو اس کے کل (دیروز) اور آج میں عملی طور پر کچھ فرق نہیں ہوتا۔ لیکن بایں ہمہ وہ تمام مسلمانوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے اور پھر یہ جذبہ تجدد و منافرت اس طرح ترقی کرتا چلا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا بدترین دشمن ہو جاتا ہے۔ اور اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا (مسلمانوں کی خوش حالی سے وہ جل اٹھتے ہیں اور ان کے مصائب سے خوش ہوتے ہیں) انکی جماعت بندی کا سیمنٹ یہی جذبۂ منافرت ہے۔ اسی سے ان کی جداگانہ جماعت کا وجود قائم ہے۔ ان میں ان جذبات نفرت کو شدید سے شدید تر کیا جاتا ہے تاکہ اس سے ان کی جماعت مستحکم رہے۔ وہ سارے مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ جو مراعات مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ان میں مسلمان بن کر برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ برابر کے ہی نہیں بلکہ اب تو شریک غالب کی حیثیت سے۔

یہ تحریک برٹش گورنمنٹ کے بل بوتے پر قائم تھی۔ جب انگریزوں نے ہندوستان سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تو یہ تحریک بھی مرجھانے لگ گئی۔ اب انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، بات کی بچ یا "پیری مریدی" کے مصالح ہیں جو اس کے مٹنے والے آثار کو قائم رکھے ہیں۔ اس سے زیادہ بحیثیت ایک تحریک کے اس کی کوئی اصل باقی نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے یہ نقوش و شواہد بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر آنے والے مورخ کے پاس سوائے اس نقصان عظیم کے جو مسلمانان ہند کو اس سے پہنچا، اس کا کوئی نشان راہ باقی نہیں رہے گا۔

لیکن اسے ہماری شومئی قسمت کہیئے یا خطۂ پنجاب کی زرخیزی کا کرشمہ کہ عین اس زمانہ میں جب اس پرانی تحریک میں پت جھڑ شروع ہوئی، وہیں سے ایک نئی تحریک نے اپنی پہلی کونپل نکالی جو اپنی نفسیاتی کیفیت اور مکینک کے اعتبار سے اس پرانی تحریک کی بردنہ ہے۔ یہ تحریک اسلامی جماعت کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے تذکرہ سے اس قصے کی ابتدا ہوئی ہے۔ مسلمانان ہند کی تحریک آزادی کے ابتدا میں، بنیادی مابہ النزاع مسئلہ یہ تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں یا ہندوستان کے دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کا جزو بنتے ہیں۔ جمہور مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کے حق میں تھے اور اس پر ان کے سیاسی دعاوی کی بنیاد تھی۔ رسالہ ترجمان القرآن کے ایڈیٹر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس زمانہ میں متحدہ قومیت کے نظریہ کی سخت مخالفت کی اور اس طرح جمہور مسلمانوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے (غالباً) ۱۹۴۱ء میں، اپنی جداگانہ جماعت کی تحریک چلائی جس کی اساس اس معصوم اور مقدس آواز پر تھی کہ مسلمان جب تک سچے معنوں میں مسلمان نہیں بن جاتا، جب تک وہ خدا کے رنگ میں نہیں رنگا جاتا، اس وقت تک اسے فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، کون مسلمان ہے جسے اس دعوت سے اختلاف ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس آواز میں ایسی دل کشی اور اس دعوت میں ایسی جاذبیت تھی کہ لوگوں نے اس پر اسی طرح لبیک کہا جس طرح براہین احمدیہ

کی اشاعت پر بلکہ اس سے بھی زیادہ کہ یہ نئی تحریک (Movement) طریق پر پیش کی گئی تھی۔ ہمیں اس وقت ان حرکات سے بحث نہیں جو اس تحریک کی تخلیق کے باعث ہوئے لیکن اس جماعت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آپکو اسلامی جماعت کہکر باقی مسلمانوں کے غیر اسلامی ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح بُعد و منافرت کا وہی بیج جس پر تحریک قادیانیت کی اساس تھی، از سر نو بو دیا گیا۔ اس کے بعد امیر جماعت (یعنی خود مودودی صاحب) نے جماعت کے اراکین کی تجدید ایمان کی اور اس طرح اپنے دست حق پرست پر گویا انہیں نئے سرے سے مسلمان کیا (ملاحظہ ہو جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع کی روئداد) مسلمان اس زمانہ میں ہندو اور انگریز کے متحدہ محاذ کے خلاف اس سیاسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے یا مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنے کا موقع مل جائے۔ مسلمانان ہند پر یہ دور بڑا نازک تھا اور غیر مسلم عناصر پوری کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کے نظریہ کی حامل جماعت کی قوتوں میں کسی نہ کسی طرح ضعف و انتشار پیدا کر دیا جائے کہ اس میں ہندو کی فتح کا راز مضمر تھا۔ عین اس کشمکش کے زمانہ میں اسلامی جماعت نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہر اگلنا شروع کیا کہ جس سے ان کی اجتماعی کوششوں میں انتشار پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ آپ اس جماعت کے آرگن ترجمان القرآن اور دیگر جرائد و رسائل کے فائل اٹھا کر پڑھئے اور دیکھئے کہ کس منظم طریق پر مسلمانوں کی اُس سیاسی جدوجہد کی مخالفت کی جاتی تھی جس سے ان کی ملی زندگی اور موت کا سوال وابستہ تھا۔ قادیانی تحریک نے مسلمانوں کو کافر بنایا تھا۔ مودودی صاحب نے انہیں من حیث القوم منافق قرار دیدیا۔ کافر اور منافق میں جو فرق ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن میں "حقیقت نفاق" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا جس میں لکھا تھا۔

> منافقین کی مذکورہ بالا اقسام تو وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان کے علاوہ ایک اور قسم بھی اس زمانہ میں پائی جاتی ہے۔ جس کا وجود عہد نزول قرآن میں نہیں تھا، اور نہ قدرتاً ہونا چاہیئے تھا۔ یہ قسم ان نسلی اور خاندانی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کے دماغ تو غیر اسلامی نظریات اور اصولوں پر پوری طرح ایمان لائے ہوئے ہیں اور اسلامی اصول اور قرآنی تصورات سے یکسر بغاوت کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کو "مسلمان" کہتے اور مسلمان کہلائے جانے پر مصر ہیں، اور ان کا یہ اصرار کسی غرض یا کسی ذاتی مصلحت پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ دوسرے منافقوں کا خاصہ ہے، بلکہ انہیں لفظ "اسلام" اور "مسلمان" کے ساتھ ایک گہرا پیدائشی تعلق ہے اور اس تعلق کے قیام و بقا میں وہ سخت متعصب واقع ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دنیا میں بے شمار قومیں ہیں اسی طرح انہوں نے "مسلمان" کے لفظ کو بھی ایک قوم کے نام کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اور جس طرح ہر انسان کو اپنی قوم سے ایک خصوصی لگاؤ ہوتا ہے۔ خواہ اس میں اور اس کے دوسرے ہم قوم افراد میں کتنا ہی زبردست اختلاف فکر و نظر موجود ہو۔ اور نفسیاتی

اعتبار سے اس لگاؤ میں اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ بسا اوقات انسان کسی قیمت پر اس لگاؤ کو قربان نہیں کر سکتا، بالکل اسی طرح یہ مسلمان زادہ بھی اپنی قومیت کے نشان یعنی لفظ مسلمان کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور جب کوئی موقع قومی حمایت کا آتا ہے تو دوسرے منافقین کی روش کے برعکس یہ مسلم قوم کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتا ہے اور اس جاں فروشی کے مظاہرہ میں نہ تو اس کی کسی بدنیتی کا دخل ہوتا ہے نہ خود غرضی یا جاہ طلبی کا، بلکہ یہ اثر ہوتا ہے محض اس تعصب کا جو اسے اپنی قومیت کے ساتھ ہے۔

اس سے ذرا آگے چل کر تحریر ہے۔

لیکن، جیسا کہ کہیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اس وقت ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے جس کا نام ہم نے غیر شعوری منافق رکھا ہے۔ یہ طبقہ، اپنے خیالات، مقاصد زندگی اور طرز عمل کے اعتبار سے تو اسلام سے بالکل منحرف ہے۔ مگر اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر نہ صرف مصر ہے، بلکہ اسلام کے نام پر جان دینے کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور بس مسلمانوں کو سربلند دیکھنے کے لئے مرا جاتا ہے۔ اس کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لئے ویسی ہی عصبیت اور جاہلی حمیت ہے جیسی ایک پیدائشی ہندو میں ہندوئیت اور ہندوؤں کے لئے، اور ایک پیدائشی سکھ میں سکھ مت اور سکھوں کے لئے ہوتی ہے۔

جمہور مسلمانوں کے علاوہ، ان کے ناوک استہزاء و تخریب کا سب سے بڑا ہدف، مسلمانوں کی قیادت تھی۔ چنانچہ اس قیادت کے خلاف انہوں نے مسلسل "جہاد" جاری رکھا اور اس کی تذلیل و تحقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انہوں نے اپنی جماعت کو تاکید کر دی کہ مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک میں کوئی حصہ نہ لیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ جماعت ایک مستقل فرقہ بن گئی جس کی اب کیفیت یہ ہے کہ، مرزائی حضرات کی طرح، جونہی کوئی شخص اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ، مقدسوں کے طائفوں کا فرد سمجھنے لگ جاتا ہے اور باقی مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن سمجھ کر انہیں نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔

اس جماعت نے اس تمام دوران میں پاکستان کی مخالفت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی کھلے بندوں اسے زہر ہلاہل کہا کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی جو اگرچہ اسلامی جماعت میں شامل نہیں تھے، لیکن ان کے نگاہ فریب دلائل سے متاثر ہو کر تحریک پاکستان سے دل برداشتہ ہو گئے اور بہت سے ایسے تھے جن کے دلوں کا یقین ریب و تشکیک سے بدل گیا۔ غرضیکہ بہ ہیئت مجموعی، مسلمانوں کی اس اجتماعی تحریک کو جس قدر نقصان اس جماعت نے پہنچایا، کھلے دشمن اتنا نہیں پہنچا سکے۔ اس کی وجہ خود اسی جماعت کی زبان سے سن لیجئے۔

"حقیقت نفاق" کے مضمون میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ارشاد ہے۔

اسلام کے مقابلہ میں دو طاقتیں ہمیشہ سے نبرد آزما چلی آرہی ہیں۔ ایک کفر، دوسری نفاق۔ تاریخ اسلامی کے ابتدائی صفحات ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام کی راہ میں جتنی مشکلات کفار نے پیدا کیں وہ ان موانع کی بہ نسبت کہیں کم اور بے ضرر تھیں جو منافقین کی بدولت پیش آئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کفار بھی اکثر معاندانہ کارروائیاں انہیں منافقین کی خفیہ ریشہ دوانیوں کی رہین منت ہوا کرتی تھیں۔ بارہا انہوں نے مشرکین کو لڑائی پر ابھارا، غزوات میں مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں سے نقصان پہنچایا، رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام کی توہین و تذلیل کی، وطن اور حسب و نسب کے جھگڑے برپا کر کے مسلمانوں کی جمعیت پراگندہ کرنے کی کوششیں کیں، تقسیم غنائم کے مواقع پر کمزور ایمان رکھنے والوں کو رسول اللہ سے بدظن کیا، اسلامی نظام کے تندرست پیکر میں طرح طرح کے وبائی جراثیم داخل کرنے کی سعی کی۔ غرض ضرر رسانی کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے تھے ان میں سے کسی کو بھی فتنہ و شیطنت کے علمبرداروں نے باقی نہ اٹھا رکھا۔ کفر تو اسلام کے مقابلہ میں بے نقاب آتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ اپنی عداوت کا اعلان کر کے کھلے میدان میں دعوت پیکار دیتا ہے۔ لیکن نفاق پیشانی پر دوستی و رفاقت کا لیبل لگا کر اسلام کے گھر میں بیٹھ کر، صدہا طریقوں سے اس کی بیخ کنی کرتا ہے اور اس انداز میں کہ نگاہ ظاہر بین کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر غور فرمایئے کہ کفر کے مقابلہ میں نفاق کی خطرناکیاں کتنی زیادہ کتنی بے پناہ اور کیسی کارگر ہوں گی۔ دن کی روشنی میں زمین پر پڑے ہوئے بڑے سے بڑے اژدھے کو مار ڈالنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن جو ناگن آستین میں چھپی بیٹھی ہو اس کے زہر سے بچنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

غرضیکہ یہ تھا اس جماعت کا موقف تقسیم ہند سے پیشتر۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مرزائی حضرات کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کافر بھی کہتے ہیں اور مسلمانوں کی مراعات میں برابر کے شریک بھی ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اسلامی جماعت کی ہے۔ وہ عمر بھر مسلمانوں کو منافق قرار دیتے۔ تحریک پاکستان کی مخالفت کرتے، اور ان کی قیادت میں کیڑے ڈالتے رہے، لیکن تکمیل پاکستان کے بعد پاکستان کے سب سے بڑے حامی بن بیٹھے۔ لیکن یہ حمایت بھی در اصل اسی تخریب کے لئے ہے جس کی تبلیغ وہ اتنے عرصہ سے کرتے چلے آئے ہیں۔ انہوں نے اب صرف پینترا بدلا ہے۔ اب وہ نہایت غمخوارانہ انداز میں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ہماری مان لیتے تو مصیبتوں کے یہ پہاڑ ان پر کیوں ٹوٹتے؟ اور اس کا قطع کا بند!

وہی ہوس قیادت!

مرزائی حضرات کی یہ کیفیت ہے کہ جب کبھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ جھٹ مرزا صاحب کی کتابوں کے ورق الٹنے شروع کر دیتے ہیں اور کوئی نہ کوئی پیش گوئی نکال کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اس سے مرزا صاحب کی صداقت کی ایک اور دلیل مل گئی۔ یعنی انہیں مسلمانوں کی اس مصیبت سے دکھ نہیں پہنچتا۔ اس چیز سے خوشی ہوتی ہے کہ وہ مصیبت مرزا

کی صداقت کی دلیل بن گئی۔ گذشتہ سال اور اس کے بعد مسلمانان پاکستان پر جو قیامتیں ٹوٹیں، ان پر اسلامی جماعت کے اراکین کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ ہر نئی مصیبت پر مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے کہ "اور اتباع کرو اپنی قیادت کی! دیکھا امیر جماعت اسلامی نے کتنا عرصہ پیشتر کہہ دیا تھا کہ اس غلط قیادت کے نتائج بہت ہیبت ناک ہوں گے" یعنی جب مسلمانوں کے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوتی ہے یہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کے امیر کی سیاسی بصیرت کی داد مل گئی!

یہ ہے مختصر سا خاکہ اس جماعت کا جو اپنی مثیل جماعت کی جگہ لے رہی ہے۔ سادہ لوح مسلمان پھر ایک بار فریب کھا رہا ہے کہ یہ جماعت نہایت مقدس عزائم کی حامل ہے۔ اس کی مخالفت خدا اور رسول کے پیغام کی مخالفت ہے۔ اس کا قانون شریعت کا مطالبہ کس قدر صحیح اسلامی روح کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ دینی مسلمان جو ہر تیز رو کے ساتھ "تھوڑی دور چلنے کا عادی ہو چکا ہے۔ اس گروہ کے ساتھ بھی چل رہا ہے اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ یہ راہ ٹھیک کعبہ کی طرف لیجائیگی۔ لیکن ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ جس تحریک کی بنیاد مسلمانوں کے خلاف جذبۂ منافرت پھیلانے پر قائم کی گئی ہو۔ جو نظریۂ پاکستان کی اس سختی مخالف رہی ہو جو ان کی قیادت کے خلاف ایسا کھلا کھلا زہر اگل چکی ہو ان کے دل میں مسلمانوں کی بہی خواہی کا درد کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ ان کے نزدیک موجودہ مسلمانوں کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ آخر الامر یہ تحریک اس تحریک سے بھی کہیں زیادہ نقصان رساں اور خطرناک ثابت ہوگی جس کی یہ نقل (بر وزا اولہ Modern Form) ہے۔ اس سے بھی زیادہ مہلک۔ اس لئے کہ اُس تحریک کا مقصد مسلمانوں میں محض تشتت و انتشار پیدا کرنا اور انہیں جذبۂ جہاد سے بیگانہ بنا دینا تھا۔ ان کی سیاسی قیادت حاصل کرنا نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس تحریک کا سب سے پہلا مقصد سیاسی قیادت کا حصول ہے۔ اور اس کے لئے ان کا صغریٰ کبریٰ بالکل واضح ہے۔

(۱) مسلمانوں کی موجودہ قیادت انہیں جہنم کی طرف لے گئی اور لئے جا رہی ہے۔

(۲) قیادت کے اہل، حاملین شریعت ہیں۔ اور

(۳) ان میں سب سے بلند مقام جماعت اسلامی کو حاصل ہے۔

(۴) نتیجہ واضح ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ اس جماعت کے مقاصد کیا ہیں۔ یاد رکھئے اگر اس جماعت کو تقویت حاصل رہی تو یہ نہ مملکت پاکستان کو مستحکم ہونے دیگی، نہ یہاں کسی حکومت کے پاؤں جمنے دیگی، نہ کوئی نظام چلنے دیگی۔ الا یہ کہ زمام حکومت خود ان کے ہاتھ میں ہو اور جس نظام کو یہ شرعی نظام قرار دیں۔ وہ نظام ان کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہو۔ جب تک یہاں کوئی نظام جدید رائج نہیں ہوتا یہ شرعی نظام کا مطالبہ کرتے رہیں گے اور اگر مسلمانوں نے کوئی اسلامی نظام رائج کر لیا تو ان کی طرف سے یہ اعتراض شروع ہو جائے گا کہ اس نظام کو چلانے والوں کی سیرت اسلامی نہیں۔ لہٰذا ان کا رائج کردہ نظام بھی صحیح اسلامی نظام نہیں قرار پا سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ اس چیز سے مطمئن ہو جانا کہ چونکہ ان لوگوں نے رضا مودودی صاحب کی گرفتاری کے بعد) اپنے مطالبہ اور اس کے حصول کی جدوجہد کو سردِ خانے التوا میں ڈال دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس لئے اب خطرہ کی کوئی بات نہیں، اپنے آپ کو کس قدر غلط فہمی میں مبتلا رکھنا ہے۔ ان کا یہ پروگرام محض ہنگامی نہیں بلکہ اس پر تو ان کی جماعت کے وجود کا قیام ہے۔ باقی رہی ان کی یہ رجعت، تو یہ بھی اس تحریک کی تقلید میں ہے جس کی یہ مثیل ہے۔ جب مرزا صاحب پر یہ مقدمہ چلایا گیا تھا تو انہوں نے عدالت میں معافی مانگ لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ میں آئندہ اپنی پیش گوئیوں کی اشاعت نہیں کروں گا۔

اس طرح امیر جماعت اسلامی نے جب دیکھا کہ جنگ کشمیر کے معاملہ میں ان کے فتویٰ سے معاملہ نزاکت اختیار کر گیا ہے تو انہوں نے بھی جھٹ اس سے رجعت فرمالی اور اس تبدیلیٔ فتویٰ کے لئے اس قسم کے لطائف دلائل اور رکیک تاویلات سے کام لیا جن پر عقل روئے اور بصیرت ماتم کرے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ وہ اپنے معافی نامہ میں اس سے بھی آگے بڑھے۔ مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ کے متعلق انہوں نے برسوں تک جو زہر افشانی کی ہے وہ ہر اس شخص کے سامنے ہے جو ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ وہ کیوں جائیے۔ ترجمان القرآن کے دورِ جدید (اشاعتِ لاہور) میں انہوں نے پہلے پرچہ سے ان تباہیوں اور بربادیوں کو گننا شروع کر دیا جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی غلط قیادت کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد، جولائی ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں تحریر فرمایا۔

> مسلمانوں نے، اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالے کر دیئے جو ان کے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح، کس صورت میں، ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو اٹل ہے۔ اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل ہمیں اب درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آپڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اس قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں؟

سن لیا آپ نے کہ مسلمانوں کی قیادت کے متعلق کس رائے کا اظہار کیا جا رہا ہے؟ لیکن اس کے تھوڑے عرصہ بعد جب مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں قانونی گرفت کا تصور سامنے آیا تو (قائد اعظم کی وفات پر) اسی قیادت کے متعلق ارشاد ہوا۔

(بقایا بر صفحہ ۲۲)

عالمِ اسلامی میں حج کی اہمیت

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو انہوں نے یوم الحج کی شام کراچی سے نشر فرمائی اور جسے پاکستان ریڈیو کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔] (طلوعِ اسلام)

اِس زمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اِس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اُٹھتی ہیں جو اُن کے خرمنِ امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں۔ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بے قرار رکھا ہے یہ ہے کہ کونسی شکل پیدا کی جائے کہ اِس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ اِنسانیت کی تاریخ اِسی سوال کے حل کی مُسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اِس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اُسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔ قرآن نے انسان کی اِس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگہِ بصیرت جوں جوں اِس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اُٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا۔ تمہاری مثال اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سُوت کاتا اور پھر (خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اُسے بکھیر ڈالا۔ قرآنِ کریم کی اِس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جد و جہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اِس فلک بوس عمارت کی تکمیل کے لئے قسم قسم کے نوادرات جمع کرتا ہے۔ وہ عمارت اِس کے تمام حسین تصورات کی مرکز اور اس کی آرزوؤں کی محور بنتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا ہے لیکن ابھی وہ عمارت تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اِس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اقتضاؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے سٹے ہوئے نقوش سے آنے

والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا۔ مصر اور یونان چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ادوارِ سابقہ کی طرح عصرِ حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوامِ مغرب اور اُن کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخۂ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ اُن کے آئینۂ فکر میں قومی محبت (Patriotism) کو شرفِ انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے۔ لیکن جنگِ اوّل نے بالعموم اور اُس کے بعد جنگِ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ چنانچہ اب دانایانِ مغرب اپنی اس سوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر مکسلے نے پچھلے سال لکھا تھا۔

"قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بحیثیتِ انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے، انانیت اور تکبّر پیدا کرتی ہے، باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔"

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں حتیٰ کہ تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ کو ایک گروپ بنا دینے کی تجویز یا مجلسِ اقوامِ متحدہ اور اُن کی حفاظتی کونسل کا قیام، یا وِنڈل وِلکی کا One World کا تصور اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اقوامِ مغرب کے موجودہ تصوّریات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو۔ نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصوّر کر کے اُن کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر GAILLD اپنی کتاب Time and Nature, Man میں لکھتا ہے

اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک زمین انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جب دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے قرآن نے یہ بتایا کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ

مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ - چونکہ تمام نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے اس لئے اِس مقصد کے پیشِ نظر کہ اُن کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں محمدؐ نے ایسی تعلیم دی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے - چنانچہ اُس نے حضرات انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اِس تعلیم کے حامل تھے فرمایا کہ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ - تمہاری اُمّت ایک اُمّتِ واحدہ ہے اور ان کی وجہ جامعیت اِس حقیقت پر ایمان کہ اُن سب کا پروردگار ایک ہے، اور اس وحدتِ انسانی کی عملی شکل اِس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو، سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں - یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کی رُو سے انسانوں تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصوّر کر کے، جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی تشکیل کرنا ہے - اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے - جو اسلام کا آخری رکن ہے -

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان جو اِس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے، الحاکمیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے جو فطرتِ انسانی کا ترجمان ہے، اپنے اپنے ملک سے اپنے نمائندے چنیں - یہ نمائندے، اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیرِ قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں - عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو - پھر یہ تمام اُمرائے ملّت اپنے میں سے ایک امیر الامراء کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر، باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کریں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتیٔ انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادت آدمیت کا کفیل ہو - ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے - اِس کے بعد یہ تمام نمائندگان مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں، اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اِس کا عملی اثر اور ردِّ عمل کیا ہوگا - وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی جس کے لئے قربانی تجویز کی گئی ہے - اِس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اُس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں - یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو ایک اُمّتِ واحدہ بنانے اور اُن کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے - قرآنِ حکیم نے حج کے اِس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے - آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند اور گہری انداز بیان اِس سے زیادہ بلیغ بھی ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع کی

مقصود یہ ہے لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں۔ اور اس کی غایت ہے قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمنٹ، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ قِيَامًا لِّلنَّاسِ کسی خاص قوم، خاص جماعت خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد۔ یعنی قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔

کہا جا سکتا ہے کہ آج اقوامِ متحدہ کی مجلس (U. N. O.) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی رہے۔ پھر یہ اجتماعات اپنے مقصد پیشِ نظر میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر وہ اجتماع ایسے بلند اور درخشندہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ حج کے اجتماع میں فی الواقعہ ایک خصوصیت ہے، اور وہ خصوصیت ہے ایک بندۂ مومن کی اُس عہد و پیمان کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایک عبدِ مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ میری نمازیں، میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ فقط اللہ کے لئے ہے کسی اور غرض کے لئے نہیں۔ اور چونکہ اللہ کی ذات، تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس لئے عہد و پیمان سے مقصود یہ ہے کہ میری تمام جد و جہدِ زندگی ارتقائے شرفِ انسانیت کے لئے ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید، اس اجتماعِ عظیم سے پہلے، تمام نمائندگان نہایت فدا کارانہ انداز سے خدا کے گھر، یعنی ملتِ حنیفہ کے مرکزِ محسوس کے گرد گھوم کر کرتے ہیں اور اس طرح زمین و آسمان کو اپنے اس عہد پر گواہ ٹھہراتے ہیں۔ اس نصب العین کو دل میں لئے ہوئے یہ نمائندگانِ نوعِ انسان، انسانیت کی فلاح و سعادت کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا میں کسی دوسرے اجتماع کو حاصل نہیں۔ فلہذا وہ اجتماعات، بلند آہنگ دعووں کے باوجود، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہ آج تک کچھ کر سکے ہیں نہ آئندہ کر سکیں گے۔ پہلی جنگ کے بعد، اقوامِ مغرب نے جمعیت الاقوام (League of Nations) کی طرح ڈالی لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں کفن چوروں کی یہ جماعت بُری طرح سے ناکام ہوئی۔ واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اس کے متعلق (Emery Reves) اپنی کتاب (The Anatomy of Peace) میں لکھتا ہے کہ

"لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے، باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔" دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے، پھر اپنے ناکام تجربے کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے

لیگ آف نیشنز کا نام (United Nations' Organisation) رکھ دینے سے کامیابی ہو جائیگی۔ یہ جمعیتِ اقوامِ متحدہ کس بُری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اُس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار ڈیلی میل نے لکھا ہے کہ "جمعیتِ اقوام اپنی موجودہ حیثیت میں امنِ عالم کے لئے سخت خطرہ کا موجب ہے۔ اس لئے اِسے فوراً ختم کر دینا چاہیے"۔ اور اسکی وجہ (Daily Mail) کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اُسے کس طرح دُور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعے دُور نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوعِ انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت، یعنی وہی چیز جس کو علامہ اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے اِن الفاظ میں کہا تھا کہ۔

اِس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام + پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود + اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام + جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

حج سے مقصود اِسی "جمعیتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اِس حج پر نگاہ رکھئے اور پھر اُس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئینِ کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں اُن کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دُنیا کے نقشہ پر کہیں ان کا نشان نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھتی جو فریضہ ربط و اخوت ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی ہم اُسے ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوامِ عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں اُنہی کے پیمانوں سے ناپی جائیں گی لیکن جس وقت اپنے اللہ سے کیا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصّہ آئیگی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہو گی۔ آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

انجمن افلاک

رات افلاک پہ تھی انجمن روح و ملک
نور و تقدیس سے معمور تھا ایوان فلک

مرکز دائرہ میں عرش جلالِ لاہوت
اردگرد اس کے صف آراستہ اہلِ ملکوت

دائیں جانب ادب آموز رسولوں کی قطار
بائیں پہلو میں ولی اور صفی سجدہ شمار

جنّت سامعہ آوازۂ سبحان اللہ
جلوہ افروز بہر حال و بہر شان اللہ

سامنے کی طرف اک نور کا دروازہ کھلا
اس سے داخل ہوئے کچھ لوگ کہ یہ ہیں شعرا

یہ سنائی ہیں، یہ رومی ہیں، یہ عطار آئے
یہ عراقی ہیں، یہ سعدی گہربار آئے

ایک ہندی بھی ہے اس قافلہ میں اہل کمال
زندہ رود[1] اس کا یہاں نام ہے اور واں اقبال

خیر مقدم کیا جبریل نے بڑھ کر ان کا
اور دریافت کیا آنے کا مقصود ہے کیا؟

پیر رومی نے کہا "اے کہ ہے تو محرم راز!
ساغر ہند ہے ساغر کش صہبائے حجاز"

"آ رہا ہے حرم قدس میں زاری کیلئے
طالب اذن ہے کچھ عرض گزاری کیلئے"

لمحہ بھر چھپ کے نمودار ہوئے روح امیں
اور کہا "اذن ہے اے خطۂ مشرق کے مکیں!

اٹھے اقبال، بڑھے، جھک کے ہوئے سجدہ گزار
اور کھولی تپش دل سے زبان گفتار

"جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو"
"شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو"

---

[1] جاوید نامہ میں سیر فلک کے دوران میں علامہ کا نام "زندہ رود" رکھا گیا ہے۔

شکوہ اور اس میں جگر تاب حرارت ہیہات! — پسرِ آدمِ خاکی کی جسارت ہیہات!!

انبیا ہیں متحیر کہ یہ نادان ہے کیا — اور فرشتوں کو ہے لرزہ کہ یہ انساں ہے کیا

سر کیا شکوہ تو پھر ختم ہی کر کے چھوڑا — مئے گفتار سے پیمانے کو بھر کے چھوڑا

چھا گیا عالمِ افلاک پہ افسونِ سکوت — محفلِ قدس ہوئی منزلِ ناموسِ سکوت

نہ وہ تسبیح کی آواز نہ تقدیس کا جوش — ایک منظر تھا مہیب ایک فضا تھی رہوش

ناگہاں ایک ندا غیب سے مسموع ہوئی — کوثرِ نور میں اک موج تکلم اٹھی

"اے کہ تو مسلمِ ہندی کی وکالت کو اٹھا! — ترجمانی کا جو حق تھا وہ ادا تو نے کیا"

تیری اس شوخیٔ گفتار میں ہے سوزِ دروں — ما دروں را نگریم و نہ بنیم دبردں*

"ترا شکوہ ہے پسند اور تری فریاد قبول
ہم کو منظور ترا جذبۂ دیں، عشقِ رسول"

{ دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی }

{ رنگِ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے }

تم کو ہم دیتے ہیں زندانِ فرنگی سے نجات — اور اس قوم سے ہیں جس کے خدا لات و منات

شان ہم دیتے ہیں، عزت بھی تمہیں دیتے ہیں — جاہ و تمکین و حکومت بھی تمہیں دیتے ہیں

بحر و معدن، جبل و نہر پہ قابض ہو جاؤ — دشت و صحرا، چمن و شہر پہ قابض ہو جاؤ

---

* مستفاد از شعرِ رومی ۔ سہ ما دروں را بنگریم و حال را — ما بروں را ننگریم و قال را

اہل ثابت کرو اپنے کو تم اس دولت کا — امتحاں ہے یہ تمہاری خرد و حکمت کا

{ وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے }

اپنے اسلاف کی شہراہ پہ چل کر دکھلاؤ — اور ابلیس کے پھندوں سے نکل کر دکھلاؤ

عہدِ صدیق و عمر، سادگی و ہشیاری — وہ عدالت، وہی اخلاق، وہی دینداری

می شود ملک شما، ملک نیاگان شما
بہ ثریا برسد کنگر ایوان شما

{ قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دو — دہر میں نامِ محمدؐ سے اجالا کر دو
خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے — نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے }

علما بہرِ خدا، داعی الی الخیر بنیں — وزرا اپنے فرائض میں سبک سیر بنیں

فوج میں جذبۂ سربازی و خودداری ہو — ہر جواں قوم کا تصویرِ فداکاری ہو

ملک میں ایک بھی غدار نہ رہنے پائے — سرکش و خائن و بدکار نہ رہنے پائے

راست بازی ہو شعار اور دیانت ہو چلن — علم و تہذیب سے آراستہ ہوں اہلِ وطن

سُنّی و شیعہ کہ پنجابی و افغاں ہو تم — یہ کوئی فرق نہیں، محض مسلماں ہو تم

{ ایک ہے منفعت اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک }

وقت ہے وقت کہ ہو جائیں مسلمان بھی ایک

عرشی

نوٹ: خطوطِ وحدانی کے اندر دئی اشعار جوابِ شکوہ حضرت علامہؒ سے لئے گئے ہیں

بابُ المراسلات

نماز

براہ کرم ذیل کا خط اور میرا جواب، طلوع اسلام میں شائع کر کے شکرگذار فرمائیں

پرویز

خط۔ پچھلے کسی پرچہ میں زکوٰۃ کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن نے چونکہ اس کے نصاب کی مقدار متعین نہیں کی تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر زمانے میں وہ حکومت جو قرآنی اصولوں کے مطابق اور اسلامی سیرت کے حامل حکمرانوں سے بنے گی۔ وہ اپنا نصاب مقرر کرنے میں آزاد ہوگی۔ جس چیز کی حد قرآن مجید نے مقرر نہیں کی اس پر تم اس لئے مصر ہونا کہ آں حضرت (صلعم) کے زمانے سے لیکر آخر تک تمام مسلمانوں کی حکومتوں میں ایسا ہی دستور رہا ہے یا فقیہوں نے ایسا ہی فیصلہ صادر کیا ہے ـــ آپ کے نزدیک غلط ہے۔

لیکن اس کے ساتھ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(ا) قرآن مجید میں نماز کی تاکید موجود ہے۔ لیکن اس کے اوقات، تعداد، ارکان اور ادائیگی کی تفصیل موجود نہیں۔ جماعت اہل قرآن نے اسی بنا پر کوشش کی کہ نماز پنجگانہ کا جواز قرآن سے نکالا جائے۔ ان کی اس کی کمزوری کی ایک صریح علامت یہ ہے کہ ان میں ہی کا ایک گروہ صرف تین نمازوں کا قائل ہو سکا۔

(ب) اوقات نماز کا بھی یہی معاملہ ہے۔

(ج) نماز کے ارکان اور اس کی ادائیگی کی تفصیل بھی بڑا وقت طلب معاملہ ہے۔ اگر حدیث صرف تاریخ دین ہے اور دین نہیں جو قابل پیروی یا اطاعت ہو تو رکوع و سجود کی ترتیب بدلی جا سکتی ہے۔ سجدہ ایک بھی کافی ہو سکتا ہے۔ رکعتوں کا تعین بھی انفرادی یا مجموعی فیصلے پر ہر زمانے میں بدلا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ جو کچھ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے اس کی جگہ جو چیز قرآن سے مناسب سمجھی جائے تلاوت کی جا سکتی ہے

چنانچہ اہل قرآن کے ایک گروہ نے موجودہ طریقۂ تلاوت نماز کو بدل کر مولوی عبداللہ مرحوم کے قائم کردہ طریقۂ تلاوت کو ترجیح دی ہے۔

(اہل قرآن کا ذکر بار بار کرنے سے میرا مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کا مسلک ان کا سا ہے کیونکہ مجھے یاد ہے کہ آپ نے اپنی کتابوں میں اس مسلک سے علیحدگی کا اظہار کیا ہے۔ مفہوم صرف یہ ہے کہ صرف قرآن مجید تک محدود رہنے سے یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے)

کافی عرصہ ہوا کہ میں نے آپ کا پمفلٹ ثنویت پرستی پڑھا تھا۔ اب ان شکوک کو لکھتے ہوئے میں نے وہ رسالہ تلاش کیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ اس لئے میں حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔

اس رسالہ میں آپ نے کہا تھا کہ نماز کا معاملہ تواتر سے حل ہو سکتا ہے۔ چونکہ ساڑھے تیرہ سو سال سے نماز اسی نہج پر پڑھی جاتی رہی ہے اس لئے آج بھی ہمیں اسی طرح پڑھنی چاہیئے۔

اگر نماز کے معاملہ میں تواتر کی دلیل صحیح ہے تو زکوٰۃ میں کیوں نہ ہو؟ براہ مہربانی اس تضاد کو رفع کرنے میں مدد دیجئے۔ بشیر احمد دار لاہور

جواب:-

میں نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن قوانین کا صرف اصولی ذکر فرمایا ہے اور ان کی جزئیات کو متعین نہیں کیا، ان جزئیات میں زمانہ کے بدلنے والے تقاضوں کے ماتحت ردو بدل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تغیر و تبدل کا مجاز کوئی فرد یا افراد کی جماعت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ حق صرف جانشینان رسول ؐ کو حاصل ہے۔ اور جانشین رسول اللہ سے مراد ہے وہ حکومت جو قرآن چلانے کے لئے، قرآنی اصولوں کے مطابق عمل میں آئی ہو۔

سب سے اول تو یہ دیکھئے کہ اس میں بحث قوانین سے ہے، عبادات سے نہیں۔ کسی قانون کی جزئیات میں، زمانہ کے بدلنے والے تقاضوں کے ماتحت، ردو بدل کی ضرورت بالکل واضح ہے، لیکن عبادات میں یہ ضرورت بالکل شاذ ہے۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ ہی کو لیجئے۔ زکوٰۃ (یعنی حکومت کے ٹیکس) کی شرح میں تغیر و تبدل کی ضرورت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس نماز کو لیجئے تو زمانے کے تقاضے (ذاتی رجحانات نہیں بلکہ زمانہ کے تقاضے) اس کی جزئیات پر کہاں اثر انداز ہونگے! وہ کونسی ضرورت ہو گی جو اس کی مقتضی ہو کر رکوع میں سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون کہا جائے۔ یا سجدہ، دو کی بجائے ایک ہی ہو۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ ارکان صلوٰۃ، قیام، رکوع، سجود، اوقات، رکعات، وغیرہ کے متعلق خود قرآن میں ایسی تصریحات موجود ہیں کہ ان کے پیش نظر نماز کی ترتیب میں ردو بدل کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے

لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ نماز کی موجودہ جزئیات میں بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں۔ ہر چند یہ اختلافات بہت جزئی سے ہیں۔ لیکن جب ہم جزئیات سے بحث کر رہے ہیں تو ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے مطابق اسلامی

حکومت کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان اختلافات کو بتدریج مٹاتی چلی جائے جو مسلمانوں میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کی دیواریں بن کر کھڑے ہیں۔ اگر رسول اللہ کے بعد آپ کی جانشینی کا سلسلہ قائم رہتا تو یہ فرقے وجود ہی میں نہ آتے کیونکہ رسول اللہ نے ملت واحدہ کو چھوڑا تھا، فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی قوم نہیں چھوڑی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر اگر وہ حکومت، نماز کی ایک متفقہ علیہ شکل متعین کر دے گی تو اس میں موجودہ اختلافی جزئیات میں رد و بدل ناگزیر ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ، جو شکل اس حکومت کی قرآن کی طرف سے متعین ہوگی وہ شرعی نماز ہوگی۔

لیکن جس حالت میں ہمارے ہاں قرآنی حکومت نہ ہو (اور آج سے سال بھر پہلے تو ہمارے ہاں کسی قسم کی بھی اپنی حکومت نہ تھی) تو اس میں تشتت و انتشار کو روکنے یا کم کرنے کے لئے یہی صورت ہو سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر فرد اور ہر جماعت اپنی اپنی مرضی کے مطابق طریقے وضع کرتی جائے، جس حد تک ہم مطمئن ہو سکیں کہ فلاں عمل عہد رسول اللہ والذین معہ سے ہم تک علی التواتر آرہا ہے۔ اسے علی حالہ قائم رکھا جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے ماتحت ہندوستان میں (اور آج بھی، جب تک قرآنی حکومت کا قیام نہ ہو) مسلمانوں کے لئے یہی راہ، سلامتی کی سمجھتا تھا (اور سمجھتا ہوں) کہ جو اعمال ملت میں تواتر سے چلے آرہے ہیں، انہیں علی حالہ رہنے دیا جائے بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی واضح حکم سے ٹکرا نہ رہے ہوں۔ اس سے قوم مزید انتشار و خلفشار سے بچ سکتی ہے۔

اہل قرآن کی بنیادی غلطی میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ان احکام کی جزئیات بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گئے جن کا صرف اصولی حکم قرآن نے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے قیاس آرائیوں کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر جن قیاسات پر یہ لوگ اس طرح سے پہنچے، وہ قوم کے لئے فیصلہ کی حیثیت تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ حق، جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے، صرف حکومت قرآنی کو حاصل ہے۔ میں دینی المرکزیت کے دور میں، اعمال متواترہ کو ایسے انفرادی قیاسات سے انسب سمجھتا ہوں۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے قوانین اور عبادات میں جو اوپر فرق کیا ہے تو وہ محض اس بات کو سمجھانے کے لئے کیا ہے کہ مؤخر الذکر میں زمانہ کے تغیرات سے رد و بدل کی ضرورت شاذ ہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوانین کا تعلق ہماری دنیاوی زندگی سے ہے اور عبادات کا تعلق آخرت سے یا قوانین مادی دنیا سے متعلق ہیں اور عبادات روحانی دنیا سے۔ اسلام میں دنیا اور آخرت اور مادہ اور روح میں کوئی امتیازی خطوط نہیں۔ اس کی عبادات اس کے قوانین اور اس کے قوانین اس کی عبادات ہیں۔ ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت، زندگی کے لئے خود ایک قانون کا درجہ لئے ہوئے ہے۔ اسی

نہج سے آپ سمجھنا چاہیں تو جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے، وہ قانون اور عبادات دونوں پر منطبق ہوگا۔ یعنی اگر جانشین رسول اللہ (یعنی قرآنی حکومت) نماز کی بنیادی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا اپنے زمانہ کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ ردوبدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی۔ ہماری دشواری یہ ہے کہ جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ردوبدل کا تصور کرتے وقت ہماری موجودہ حکومتوں کے ارباب حل وعقد ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس تصور سے ہماری روح کانپ اٹھتی ہے کہ ان لوگوں کو یہ حق دیدیا جائے کہ یہ ان احکام میں تغیر و تبدل کر دیں جو رسول اللہ نے متعین فرمائے تھے! ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حق صرف رسول اللہ کے جانشینوں کو پہنچتا ہے اور کسی کو نہیں۔ اور جانشین رسول اللہ، جب رسول اللہ کے کسی حکم میں تبدیلی کا خیال کریں گے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی وقت ایسا کریں گے جب وہ دل کے پورے اطمینان و یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اگر اس وقت رسول اللہ موجود ہوتے تو وہ خود اپنے اس حکم میں ایسی تبدیلی فرما دیتے۔ یہ تمام الجھاؤ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

والسلام

قربانی

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:-

براہ کرم مطلع فرمائیے کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر جو قربانی دی جاتی ہے اس کی دینی حیثیت کیا ہے اس باب میں اگر میں ذرا جرأت سے کام لوں تو امید ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ قربانی، حضرت خلیل اکبرؑ کی یادگار ہے جسے قرآن نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ تم ہر سال اس طرح جانور ذبح کر کے اس یاد کو منایا کرو۔ پھر اس کی اصل کیا ہے؟ معاف فرمائیے! اب کیفیت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ مسلمان (کم از کم پڑھا لکھا طبقہ) اسے محسوس کرتے ہیں کہ اس سے قوم کا بہت سا روپیہ بیکار جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس احساس کو باہر کہیں بیان نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی شعار ہے اس لئے اس کے خلاف لب کشائی جائز نہیں۔ امسال کی عید پر ہمارے اقتصادی معاملات پیچیدہ تر ہو چکے تھے۔ بیشتر افراد ملت کا اثاثہ غارت ہو چکا ہے۔ بے شمار گھروں میں بے خانماں اقربا اور یتامیٰ موجود ہیں۔ ان عوامل کا دباؤ لا محالہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقعہ پر اس قسم کی سرگوشیاں اکثر سنی گئیں کہ "صاحب میرے ہاں تو اس قدر مہاجر پڑے ہوئے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر کس طرح قربانی دے سکتا ہوں" لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو "چور" سا محسوس کرتے ہیں کہ قربانی نہ دینے سے وہ گنہگار ہو جائیں گے۔ میں خود بھی ان ہی "مجرموں" میں سے ایک ہوں۔ اس لئے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قربانی کی دینی حیثیت کیا ہے؟

جواب :- ہمارے سامنے جب یہ سوال آتا ہے کہ فلاں معاملہ کی دینی حیثیت کیا ہے تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے ذہنوں میں کس طرح کشمکش پیدا ہو رہی ہے اور ہمارے اقتصادی یا معاشرتی حالات پر اس سے کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب قرآن کا صحیح فیصلہ سامنے آجائے تو اس سے وہ تمام ذہنی کشمکش دور ہو جاتی ہے جو انسانوں کے بنائے ہوئے دین سے ہر قلب سلیم میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اس فیصلہ سے ہمارے اقتصادی اور معاشرتی مسائل بھی خود بخود اعتدال پر آجاتے ہیں، کہ اگر قرآن یہ کچھ نہ کرے تو وہ دین فطرت کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قربانی کے متعلق بھی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ حضرت خلیل اکبرؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اس واقعۂ عظیمہ کی یاد میں جانوروں کو ذبح کیا کرو۔ حتیٰ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ مینڈھا ذبح کرنے کا واقعہ بھی قرآن میں نہیں، تورات میں ہے۔

قرآن کریم میں جانور ذبح کرنے کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے۔ حسن اتفاق سے طلوع اسلام کی اسی اشاعت میں، محترم پرویز صاحب کی ایک تقریر شائع ہو رہی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ حج کی حقیقت کیا ہے اور اس سلسلہ میں قربانی کی کڑی کہاں اور کس مقصد کیلئے آئی ہے۔ عرفات کے میدان میں جب یہ تمام نمائندگان ملت ایک لائحۂ عمل طے کر لیں گے تو اس کے بعد منیٰ کے مقام پر دو تین دن تک ان کا اجتماع رہے گا جہاں یہ باہمی بحث و تمحیص سے اس پروگرام کی تفصیلات طے کریں گے۔ ان مذاکرات کے ساتھ باہمی ضیافتیں بھی ہوں گی۔ آج صبح پاکستان والوں کے ہاں۔ شام کو اہل افغانستان کے ہاں۔ اگلی صبح اہل شام کی طرف۔ وقس علی ذالک۔ ان دعوتوں میں مقامی لوگ بھی شامل کر لئے جائیں گے۔ امیر بھی، غریب بھی۔ اس مقصد کے لئے جو جانور ذبح کئے جائیں گے قربانی کے جانور کہلائیں گے۔ چونکہ اس اجتماع کا مقصد نہایت بلند اور خالصتہً لوجہ اللہ ہے اس لئے اس پروگرام کی ہر کڑی خدا کے "قریب تر" لانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے قربانی کی اصل۔ اسی لئے قرآن نے صراحت فرما دی ہے کہ قربانی کے جانوروں کی منزل مقصود بیت اللہ ہے

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝ (۲۲/۳۳)

قربانی کے جانوروں کی منزل مقصود کعبہ ہے۔

مقام حج کے علاوہ، کسی دوسری جگہ (یعنی اپنے اپنے شہروں میں) قربانی کے لئے کوئی حکم نہیں۔ تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے بھی مدینہ میں قربانی نہیں کی۔ جب حج کے لئے خود تشریف لیگئے ہیں تو وہاں جاکر قربانی کی ہے اور جب تشریف نہیں لے گئے تو اپنی طرف سے قربانی کے جانور امیر الحاج کے ہاتھوں وہاں بھیجے ہیں۔ اس لئے

یہ ساری دنیا میں اپنے اپنے طور پر قربانیاں ایک رسم ہے۔ اسی طرح حاجیوں کی وہ قربانیاں جو وہ آج کل کرتے ہیں محض ایک رسم کی تکمیل رہ گئی ہے۔ ایک ایک حاجی پانچ پانچ سات سات دنبے انفرادی طور پر ذبح کر دیتا ہے اور چونکہ اس قدر گوشت کا مصرف کچھ نہیں ہوتا اس لئے ان ذبح شدہ جانوروں کو گڑھے کھود کر دبا دیتے ہیں۔

ذرا حساب لگائیے کہ اس رسم کے پورا کرنے میں اس غریب قوم کا کس قدر روپیہ ہر سال ضائع ہو جاتا ہے۔ ہم قومی امداد و شمار کبھی نہیں رکھتے جس کی وجہ سے ہمیں معلوم ہی نہیں پڑتا کہ ہماری ملی متاع کس قدر ہے اور اس میں خسارہ کس قدر ہوتا ہے۔ لیکن جس قسم کی ہماری اقتصادی حالت ہے اس سے اتنا تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم کس قدر غریب واقع ہوئی ہے۔ اب اگر آپ ایک کراچی شہر کو لے لیں تو اس آٹھ دس لاکھ کی آبادی میں سے اگر پچاس ہزار نے بھی قربانی دی ہو اور ایک جانور کی قیمت تیس روپیہ بھی سمجھ لی جائے تو پندرہ لاکھ روپیہ ایک دن میں، صرف ایک شہر سے ضائع ہو گیا۔ اب اس حساب کو پورے پاکستان پر پھیلائیے اور اس سے آگے ساری دنیا کے مسلمانوں پر اور پھر سوچئے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں!

لیکن اگر ہمیں سوچنا آجائے تو پھر ہماری بربادی کیوں ہو؟

غلام اور لونڈیاں

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب قمطراز ہیں:۔

میں نے ذیل کا خط محترم سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھیجا تھا۔

میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس بارے میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے امید کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہو گی؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہو گا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہو گا اور اس پر تعداد کی تو کوئی قید نہ ہو گی۔؟

(۲) کیا اس نظام شریعت میں لونڈی و غلام کی خرید و فروخت (علاوہ ان لونڈی و غلام کے جو جنگی قیدی ہوں) بھی پاکستان کے اندر جائز ہو گی جس طرح آج کل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپ کا عنایت نامہ ملا۔ جو سوالات آپ نے کئے ہیں ان کا مختصر جواب تو ہاں اور نہیں کی شکل میں دیا جا سکتا ہے لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہو گی

اس لئے میں ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں۔

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ایسی صورت میں دی گئی ہے جبکہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہوئی ہو نہ تو قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہے۔ نہ فدیہ لیکر قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔

آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں وہ یا تو انہیں قتل کرے گی یا انہیں عمر بھر اس قسم کی "انسانی باڑوں" میں رکھے گی جنہیں آجکل (Concentration Camp) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہے۔ جس میں اس قسم کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے۔ اسی طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک شخص کا ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا اس میں اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہوا اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیران جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی لونڈی یا غلام ان سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ انہیں اور روئے قانون ایک خاص مدت تک کے لئے اسکو مہلت دینی ہوگی اور اس مدت میں اگر وہ اپنی رقم ادا کر دے تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔

اس قسم کے لونڈیوں اور غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک اس سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص تک منتقل کر دیتا ہے۔ یہ قانون میں گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح سے اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا اتفاق ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے

لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برا نہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ بلائے جان بن جاتے۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جبکہ نہ ان کا تبادلہ ہو اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلق قایم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔ قانونی حیثیت سے "ملک یمین" اور عقد نکاح میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ "ملک یمین" تو باقاعدہ حکومت کے توسط سے حاصل ہوتی ہے۔ جو عورت کسی کے ملک یمین میں دی جائے اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا جنسی تعلق جائز نہیں ہے۔ جو اولاد اس سے ہوگی اس کا نسب اصل مالک ہی سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے باپ کی اس طرح جائز وارث ہوگی جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد۔ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے، اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائیٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے، اگر لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا ہو۔ لیکن بعد کے ادوار میں امراء اور رؤساء نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا دیا، وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشاء کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کیلئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے۔

حجاز میں جو یہ فروشی آج کل ہوتی ہے اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اصولی طور پر میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جنگ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے آزاد آدمیوں کو پکڑنا اور ان کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے۔ والسلام

تقلم ابو صالح اصلاحی بحکم حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔

محترم مودودی صاحب نے میرے استفسارات کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا۔ لیکن ان کے خط سے ظاہر ہے

کہ ان کے نزدیک اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان لونڈیوں سے تمتع بھی جائز ہوگا اور اس پر تعداد کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس کی تائید میں انہوں نے جو دلائل بیان فرمائے ہیں کم از کم میں تو ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ میرا تو اس تصور سے دل کانپتا ہے کہ اسلام جو دنیا سے غلامی مٹانے کا مدعی ہے وہ خود انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے گذارش ہے کہ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا میں مودودی صاحب کے خط سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درست ہے اور آیا اسلام کی یہی تعلیم ہے؟ جواب خواہ براہ راست مجھے تحریر فرما دیں خواہ طلوعِ اسلام میں درج فرما دیں۔ والسلام

طلوعِ اسلام

ہمارے بھائی نے مودودی صاحب کے خط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ اسلام میں اسیرانِ جنگ کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے اور ان لونڈیوں سے، بلا قیدِ نکاح و تعداد، جنسی تعلقات بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ باقی رہے ان کے دلائل تو وہ یقیناً ارسطو کے ان دلائل سے زیادہ دقیع اور قوی نہیں ہیں جو وہ نفسِ غلامی کے جواز بلکہ وجوب میں دیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں اس کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے وجوب میں اتنے ہی دلائل رکھتا تھا جنہیں ناقابلِ تردید سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یونان کو ارسطو کے دلائل لے ڈوبے اور اسلام کو مودودی صاحب جیسے فقہا کی منطق۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں اس اضطراب کی علت بھی معلوم ہے جس کی وجہ سے مودودی صاحب کو اس سیدھے سادے جواب کے لئے دلائل و مصالح کے سہارے تلاش کرنے پڑے، خواہ وہ دلائل و مصالح خود سہاروں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔ اور وہ علت یہ ہے کہ ایک طرف ان کا دامن روایات کی خار دار جھاڑیوں سے الجھا رہتا ہے اور دوسری طرف وہ "نادرِ خیال" بھی بننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا کشمکش لازمی ہے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

طلوعِ اسلام خدا کے عطا فرمودہ دین کو ہی دین سمجھتا ہے جو فطرتِ انسانی کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قدامت و جدت کی کشمکشوں سے بلند ہے۔ وہ جس قدر فراست بھی حاصل کر سکنے کی استطاعت... رکھتا ہے، خدا کی کتاب ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اسے ان امور میں کبھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوگا۔

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن میں اسیران جنگ کے متعلق سورۂ محمد کی ایک ہی آیت میں حکم ہے اور اس آیت کے چار لفظوں نے معاملہ کو صاف کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جنگ میں جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً

انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دو یا احسان رکھکر

اللہ اللہ خیر سلا۔ باقی رہی وہ مدت جس میں وہ بطور قیدی تمہارے پاس ہیں، تو ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں انسانوں جیسا سلوک روا رکھا جائے گا۔ کسی سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک، خود مسلمان کے شعار اور حسن فطرت کے خلاف ہے جو خدا پر ایمان مسلمان کے اندر اجاگر کرتا ہے۔ کسی انسان پر دوسرے انسان کا حق ملکیت "یکسر غیر فطری ہے۔ اسلام جو شرف انسانیت اور احترام آدمیت کی تعلیم دینے کے لئے آیا تھا اس کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی ملکیت میں دیدینے کی اجازت دیدے اور اس کے لئے راہیں کشادہ کردے۔ غلامی اسی کو کہتے ہیں اور اسلام کا دامن اس تقدس ان اتہامات سے یکسر پاک ہے۔ جو اس کے دشمنوں نے دشمنی روایات کے راستے اس پر لگائے اور جو آج ہماری شومئی قسمت سے ہمارا دین بن چکے ہیں سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

قرآن میں ملک یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو اس وقت عربوں کے ہاں موجود تھے اور جنہیں آہستہ آہستہ ان احکامات کی رو سے جزو سوسائٹی بنایا جاسکتا تھا۔ اس نے انہیں اس طرح بتدریج معاشرۂ اسلامی میں جذب کیا اور آئندہ کیلئے غلامی کے دروازے اس حکم کی رو سے بند کر دیئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی ملوکیت نے ان دروازوں کو ایک ایک کے پھر سے کھول لیا اور قیامت بالائے قیامت، کہ اس ننگ انسانیت مسلک کو دینی روایات کی رو سے منسوب کر دیا اس ذات اقدس و اعظم کی طرف جس کے ظہور کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وہ ان اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی آرہی تھی۔ ویضع عنہم اصرھم والاغلال التی کانت علیہم

مودودی صاحب غلامی کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آج کل جنگ کے قیدی جس قسم کے (Concentration Camps) میں رکھے جاتے ہیں اور ان سے وہاں جس قسم کا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے اس سے بہتر ہے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

اول تو یہ کہ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ قرآنی نظام میں بھی قیدیوں کے عبوری زمانہ میں کیمپوں کی یہی حالت ہوگی جیسی آج کل کی ابلیسی سیاست میں ہوتی ہے۔ اس نظام میں، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسانوں سے انسانوں جیسا ہی سلوک کیا جائے گا کہ وہ نظام ظلم روکنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان (Camps) کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں جو مسلمانوں کے ہاں اسیران جنگ کے لئے تیار کئے جائیں گے

ہم کہتے ہیں تو یہ کہ "اسلام" نے اس خرابی کا حل یہ بتایا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں۔ کیا عمدہ اصلاح ہے؟ ... ... انسانیت اس پر ناز کرے گی اور دنیا کے قیدی اس احسان عظیم پر سجدہ ریز، جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں، بہنیں، بیٹیاں، ان "مصلحین" کی ہوس رانیوں اور عیش کوشیوں کا سامان بن رہی ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

یعنی قیدیوں سے کام لینا مشکل ہے اور اسی طرح ان کی عورتوں کو گھروں میں رکھنا بےحد پرخطر۔ لیکن انہیں جب غلام بنا لیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ان کی عورتوں سے جب ان کے مردوں کے سامنے، ان کی اپنی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کر لئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات رفع ہو جائیں گے جو دشمن کے قوم کے افراد ہونے کی بنا پر ان کی طرف سے وارد ہو سکتے تھے!

پھر فرماتے ہیں۔

> جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے ... اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔

یعنی اگر ایک ایک شخص دس دس بیس بیس عورتیں سنبھال لے، ان سے اُن کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات پیدا کرے۔ اور پھر جب جی چاہے انہیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے اور اس کی اس دوسرے سے قیمت بھی وصول کر لے تو یہ سب کچھ پاکیزگیٔ اخلاق میں داخل ہے۔ اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے تو وہ سوسائٹی میں مستقل بداخلاقی پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ اول الذکر بداخلاقی اس لئے حسن اخلاق میں داخل ہو گئی کہ آپ نے اسے مشروع قرار دیدیا اور موخر الذکر اس لئے حرام کاری قرار پا گئی کہ آپ کی بزرگی سے اسے جواز کا فتویٰ نہیں مل سکا۔ آریہ سماجی نیوگ کی تائید میں بھی یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ جس قسم کے تعلق کو سوسائٹی جائز قرار دیدے وہ جائز ہو جاتا ہے اس پر کسی اور کو اعتراض کا کیا حق حاصل ہے؟

لونڈیوں کی تعداد کو بے قید چھوڑ دینے کا فلسفہ بیان فرمانے کے بعد، مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

> لیکن بعد کے ادوار میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم کے ہاں لونڈیاں دھڑا دھڑ آ رہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں۔ تو پھر وہ کونسی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں؟ جسے لونڈی مل جائے اور "شریعت" اس سے جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو۔ تو پھر اس لونڈی سے تمتع، عیاشی کا حیلہ

کس طرح بن جائے گا! عیاشی کے سامان تو خود فراہم کر دیئے جائیں اور ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام بھی دھرا جائے! باقی رہا "ہر روز ایک نئی عورت سے نکاح کر کے دوسرے دن طلاق دیدینا" سو یہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نظام شریعت قرآن پر مبنی نہ ہو۔ قرآنی نظام میں طلاق دیدینا ایسا کھیل نہیں ہے۔ اس میں یہ مذاق نہیں ہو گا کہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال باہر کیا۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا ہے کہ "جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو کوئی حق نہیں رہتا اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے" لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو انہیں تو یقیناً معلوم ہو گا کہ ان کی "شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتا دی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات بھی قائم کئے جائیں اور پھر یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے اولاد پیدا ہو جائے گی اور اس طرح اسے بیچنے کا حق باقی نہ رہے گا۔[۱]

سنئے وہ تدبیر کیا ہے؟ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع الرقیق (مطبوعہ مصر، جلد دوم، صفحہ ۱۸) میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے۔

ان ابا سعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ
قال یا رسول اللہ انا نصیب سبیا فنحب الاثمان فکیف تری فی العزل
فقال او انکم لتفعلون ذالک لا علیکم ان لا تفعلوا ذالکم فانھا لیست
نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضور سے عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم انہیں بیچنا چاہتے ہیں۔ تو عزل کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ حضور نے فرمایا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونے والا خدا نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

عزل کے متعلق صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب العزل، (جلد سوم صفحہ ۱۷۲) میں جابر بن عبداللہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ۔

---

[۱] طلوعِ اسلام پر وہ وقت بڑا اذیت و کرب کا ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات درج کرنی پڑ جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جائیں لیکن کیا کیا جائے۔ بعض صورتیں ایسی پیش آ جاتی ہیں کہ ان میں یہ ناگوار فریضہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ موضوع زیر نظر میں ہم عمداً اس سے گریز کرتے رہے کہ وہ روایات درج نہ کرنی پڑیں جو لونڈیوں کے بارے میں ہماری کتب احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن ایک دو روایات تو ضرور نقل کرنی ہی پڑ گئیں۔ ان کے بغیر اصلی بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

قال کنا نعزل علی عھد النبی والقرآن ینزل

ہم حضور کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا.

اور اگر تسلی ہو جائے تو! اسی صحیح بخاری (جلد دوم صفحہ [illegible]) میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ

لا بأس ان یصیب من جاریۃ الحامل ما دون الفرج

اس میں بھی حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے.

معاذ اللہ! استغفراللہ!! یہ ہیں وہ احادیث جنہیں حضور ختمی مرتبت علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کی ذات گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور انہیں شرع بنایا جاتا ہے. کل قیامت کو خدا اور اس کے رسول امین کے سامنے کیا جواب دیں گے.

بہر حال یہ ہے وہ نظام شریعت جسے مودودی صاحب یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں. آپ اسے اپنے ہاں رائج کریں گے اور قوم مخالف کے جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی مستورات کو لونڈیاں بنائیں گے تو آپ انہیں روک نہیں سکتے کہ وہ آپ کے قیدیوں کو غلام بنائیں اور آپ کی شریف بیبیوں کے ساتھ اسی طرح جنسی تعلقات قائم کر کے انہیں آگے منتقل کرتے رہیں. یہ سلسلہ جب عام ہو جائے گا تو مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات خوش ہوں گے کہ خدا کا دین کس طرح ساری دنیا میں خود بخود پھیل رہا ہے!

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!

دورنگی

ایک مسلکِ زندگی یہ ہے کہ آپ جو کچھ کریں اس کی صحت پر آپ کو یقین ہو۔ آپ ایک عزمِ محکم کے ساتھ اس کا فیصلہ کریں اور عملِ پیہم کے ساتھ اسے تکمیل تک پہنچا دیں۔ اگر آپ کا یہ فیصلہ اور اس پر عمل، انسانیت کی میزان پر پورے اُترتے ہیں تو ان کا نتیجہ ارتقائے شرفِ انسانیت اور وجۂ سعادتِ آدمیت ہوگا۔ اور اگر یہ یقین و عمل کسی ذاتی یا قومی غرض کے لئے ہے تو اس سے کم از کم وہ مقصد تو پورا ہو جائے گا۔ قطع نظر مقصد کے ان دونوں صورتوں میں اتنا حصہ بطور قدرِ مشترک شامل ہے کہ اس سے آپ کا سینہ عدمِ یقین اور فقدانِ ایمان سے ذہنی اور شعوری کشمکش کی آماجگاہ نہیں بنا رہے گا۔

اس کے برعکس دوسرا مسلک یہ ہے کہ ایمان تو ایک طرف کفر میں بھی پختگی نصیب نہیں ہوتی۔ قدم قدم پر تذبذب و ارتیاب کی جھاڑیاں دامن گیر ہوتی ہیں جو عزم و اطمینان کے جوہرِ انسانیت کے لئے تپ دق کے مہلک جراثیم کا حکم رکھتی ہیں۔ دنیا میں جو قوم زندگی کے دوراہوں پر اس بیم و رجا کے عالم میں کھڑی رہے اس کا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا اور اس کا سینہ اس آتشِ جہنم کی بھٹی بن جاتا ہے۔ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ آج ہماری بدبختی اس سے نہیں ہے کہ ہمارے فیصلے غلط اور انہیں پروان چڑھانے کی قوت مفقود ہے۔ بلکہ ماتم اس کا ہے کہ ہمارے اربابِ حل و عقد عام طور پر اس دوسرے مسلکِ حیات پر گامزن دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارا کوئی فیصلہ مستحکم اور کوئی عمل ثمرآغوش نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر دو ایک واقعات کو لیجئے۔

حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ قائدِ اعظم کی یاد میں ڈاک کے ٹکٹ شایع کئے جائیں۔ ایسے یادگاری ٹکٹوں پر معمولاً اس شخصیت کی شبیہ ہوتی ہے جس کی یاد میں وہ شایع کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجوزہ ٹکٹوں پر کوئی انسانی تصویر نہیں ہوگی۔ اس فیصلہ کی علت یہ عام خیال ہے کہ شریعت میں تصویر کشی جائز نہیں علمائے مذہب نے بعض مستثنیات جائز قرار دی ہیں۔ اور وہ پاسپورٹ، شناختی دستاویزات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ہم سردست اس بحث میں جانا نہیں چاہتے کہ اس تصویر کے متعلق قرآن کا فیصلہ کیا ہے کہ یہ مسئلہ سرا سر تفصیل طلب ہے اور یہاں ضمناً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ہم صرف بین تضاد کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں جو اس معاملہ میں ہماری زندگی میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ جن وزراء حضرات نے یہ فیصلہ کیا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کی تصویریں عموماً اخبارات میں نہ چھپتی ہوں۔ بلکہ ان کی پبلک سرگرمیوں کا تو شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہوگا جو تصویر کی صورت میں محفوظ و مشکل نہ کر لیا گیا ہو۔ ان تصویروں کے کھینچنے اور ان کی اشاعت پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اس سے آگے بڑھئے۔ پاکستان کے مسلمان اخبارات میں ہر روز انسانی تصاویر چھپتی ہیں اور وہ ان مستثنیات کے قبیل سے

بھی نہیں ہوتیں جو علماء نے جائز قرار دے رکھی ہیں۔ ان میں "دنیادار" لوگوں کی تصاویر بھی ہوتی ہیں اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ جیسے ارباب مذہب کی بھی۔ لیکن ایک بھی تو "اسلامی اخبار" نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ وہ انسانی تصویر شایع نہیں کرے گا۔ جن حضرات کی تصاویر شایع ہوتی ہیں انہوں نے بھی، جہاں تک ہمیں علم ہے کبھی اس تناقض کا ذکر نہیں کیا جو ان تصاویر کی اشاعت سے متعلق ہونا چاہیئے۔ اس کے برعکس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تصاویر کشی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ خود سرکاری فوٹو گرافر موجود ہیں جو علماء کے نزدیک غیر مستثنیٰ مواقع پر انسانی تصاویر کھینچتے ہیں اور یہ تصویریں ہر روز اخبارات میں شایع ہوتی ہیں۔

اب ذرا خود قائد اعظم کی ذات گرامی کو لیجیے۔ ان کی لاکھوں تصویریں شایع ہو چکی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جو ان کے نام سے آشنا ہو اور ان کی تصویر سے خالی۔ قائد اعظم کی تصاویر عید کارڈوں اور ٹکٹوں تک پر چھپ چکی ہیں۔ اور عام طور پر یہ چیزیں اس تصویر کی خاطر زیادہ کثرت سے خریدی اور استعمال کی جاتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصاویر انفرادی افعال ہیں۔ شاید نظری طور پر ایسا کہا جا سکے لیکن عملاً ساری قوم ان افراد کی معاون ہے جو ان افعال کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قوم ان افراد کے حاصل کردہ سامان کو خریدتی ہی نہیں بلکہ اسے حرز جاں بناتی ہے۔ تعجب ہے کہ قوم کی قوم بقیام ہوش و حواس ایسے فعل کی مرتکب ہو رہی ہے جو اس کے مذہب میں ناجائز ہے۔

اگر بفرض استدلال یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ انفرادی فعل ہے اور حکومت بہ حیثیت حکومت اس ناجائز فعل کے ارتکاب میں شریک نہیں، تو حکومت کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، خود حکومت انسانی تصاویر کشی کی ذمہ دار ہے۔ اگر دیگر امور کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو خود قائد اعظم کے معاملہ میں حکومت اس "گناہ" کا ارتکاب کر چکی ہے۔ ان معمولی تصاویر کو جانے دیجیے جو قائد اعظم کی زندگی اور وفات سے متعلق حکومت کی طرف سے شایع ہوئیں۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد مغربی پنجاب کی حکومت نے قائد اعظم کی فلم تیار کی ہے۔ جس میں مرحوم چلتے پھرتے بولتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ فلم حکومت کی طرف سے بنی ہے اور شاید ہی کوئی فرد ہوگا جو اسے دیکھنے کے لیے بے تاب نہیں ہوگا۔ یہ فلم پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون پاکستان بھی دکھائی جائے گی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر ساکت و صامت تصویر ناجائز ہے تو متحرک و متکلم فلم کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ (فلم کے متعلق تو شاید یہ فتویٰ بھی مل جائے کہ اس کا دیکھنا بھی ناجائز ہے!) کیا مغربی پنجاب کے محکمہ احیائے ملت نے اس کے لیے جواز ڈھونڈ نکالا ہے؟ یا اس محکمہ کی رائے بدلی تو کیا حکومت نے اسے ٹھکرا دیا ہے؟ مغربی پنجاب کے علاوہ مرکزی حکومت نے بھی ایک فلم قائد اعظم سے متعلق بنائی ہے جو ان دنوں (اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں) کراچی میں دکھائی جا رہی ہے۔ اس فلم کی تعریف میں سب یک زبان ہیں۔ اخبارات میں فلم سازوں کی تصویریں تک چھپی ہیں اور ان سرکاری فن کاروں کی مدح و تحسین ہو رہی ہے۔ اگر یہ سب کچھ روا ہے اور مذہب اور شریعت اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تو ڈاک کے ٹکٹوں پر تصویر شایع کر دینے سے کیا ہو جائیگا؟

ہم ایسے دور میں ہیں جس میں تصویر و فلم ناگزیر ہیں۔ بیشتر مواقع ایسے ہیں جہاں وہ "جائز" ہی نہیں ضروری ہو جاتی ہیں۔ ہم نے عملاً اس ضرورت کے سامنے سپر ڈال دی ہے لیکن ذہنی طور پر ہم وہیں ہیں جہاں کبھی تھے۔ ذرا کے لیے اس تضاد اور مذاق کو چھوڑ دیجیے۔ زندگی کو ان الجھنوں سے پاک کیجیے اور ایک طرف ہو جائیے۔ تصویر یا تو جائز ہے

یا ناجائز۔ اگر جائز ہے تو اس کا اعتراف کیجئے اور شکوک کے کانٹے یقین کے پہلو سے نکال دیجئے۔ اگر وہ ناجائز ہے تو وہ عید کارڈ پر بھی ناجائز ہے اور فلم کے پردہ پر بھی۔ وہ افراد کی طرف سے ہو تو بھی ناجائز ہے اور حکومت کی طرف سے ہو تو بھی۔ یہ ناممکن ہے کہ تصویر اسٹیج پر تو جائز ہو اور ڈاک کے ٹکٹوں پر ناجائز۔ آپ جیسا عقیدہ رکھتے ہیں عمل بھی اسی کے مطابق کیجئے۔ مصائب زندگی میں دورخی، کہ جسے قرآن منافقت کہہ کر پکارتا ہے، ہلاکت انگیز فریب نفس ہے اور جلی کفر سے زیادہ مردود۔ اس سے وہ کفر کہیں اچھا ہے جو اپنے عقیدہ میں متزلزل اور اپنے کردار میں لغزش نہیں رکھتا۔ جب تک ہمارے عقیدہ و عمل میں تضاد و تخالف رہے گا ہماری حیات اجتماعیہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم مطلقاً ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ کانپتے ہاتھوں سے کوئی تیر اپنے نشانہ پر نہیں لگا کرتا۔ اس طرزِ عمل سے ہم مسلمان کیا انسان بھی نہیں بن سکیں گے اور "انعام" رہیں گے یا ان سے بھی اَضَلّ۔

وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری

دوسرا تضاد مثلاً لاؤڈ سپیکر سے متعلق ہے۔ ہم نے عید الفطر کے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے بھی لکھا تھا اور آج پھر اسے دہرانے پر... مجبور ہیں۔ ہم ہر اجتماع میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال کرتے ہیں، حتیٰ کہ یہ اعلان ہوتا ہے کہ خطبہ تک کے لئے لاؤڈ سپیکر استعمال ہوگا۔ اکبرؔ نے کبھی تنزیہ کہا تھا ؎

پہلے اُس نے مُس کہا پھر تق کہا پھر بل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

لاؤڈ سپیکر کو کبھی بالکلیہ ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اب اکبر کے الفاظ میں "مُس" کہہ دیا گیا ہے اور اسے خطبہ کے لئے جائز سمجھ لیا گیا ہے لیکن نماز کے لئے ہنوز ناجائز ہے۔ اگر لاؤڈ سپیکر کا استعمال ناجائز ہے تو وہ نماز اور خطبہ دونوں کے لئے ناجائز ہوگا اور اگر اس کا استعمال خطبہ میں جائز ہے تو یقیناً نماز میں بھی جائز ہے۔ آپ خود ہی تو یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ خطبہ در اصل دو رکعتوں کی بجائے ہوتا ہے اور اس کا ثواب اور دو رکعت نماز (عید و جمعہ) کا ثواب ملا کر چار رکعت کے برابر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ہی کے بیان کردہ آداب کے مطابق خطبہ میں ایسے بیٹھنا چاہیئے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں۔ چپ، چاپ، دو زانو، ہاتھ باندھے (یا گھٹنوں پر رکھے)، تو اگر خطبہ نماز کا ہی نصف اول یا آخر ہے تو اس کی جائز و ناجائز اشیاء نماز کی جائز و ناجائز اشیاء سے مختلف نہیں ہو سکتیں۔ اس عید پر ایک اور لطیفہ یہ بھی ہوا کہ نماز شروع ہوگئی تو لاؤڈ سپیکر کام کرتا تھا، تکبیر تحریمہ، ثنا، تین زائد تکبیریں، فاتحہ (ضالین تک) تو لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ سنائی دی لیکن اس کے بعد کسی نے "غلطی" کی تلافی کر دی اور لاؤڈ سپیکر کو بند کر دیا۔ اس کے بعد بے پناہ ہجوم میں جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ مجمع میں ایسے گوشے بھی تھے جہاں تکبیروں کی آواز تک نہیں پہنچی۔ کہیں بیک وقت کئی مکبر از خود مقرر ہو گئے اور کہیں کوئی بھی نہ تھا۔ بدنظمی اور بدمزگی کو فی الحال چھوڑیئے جو اس سے پیدا ہوئی، صرف اپنے تضاد کو دیکھئے۔ اگر لاؤڈ سپیکر کا استعمال نماز میں ممنوع ہے اور اس کے استعمال سے نماز نہیں ہوتی (بالقول

آپ کے مکروہ ہو جاتی ہے) تو اس عید کا آغاز تو مکروہ ہو گیا۔ پھر ساری نماز کیسے ہو گئی؟ کیا "مالک" تک پہنچ کر سجدہ سہو کر کے لاؤڈ سپیکر بند کر دینے سے نماز میں کوئی کراہیت پیدا نہیں ہوئی؟ گریبان میں منہ ڈالئے اور سوچئے! اور یہ نہ بھولئے کہ دنیا بھر کی نگاہیں آپ پر جمی ہیں۔ آپ دنیا کی پانچویں عظیم سلطنت اور عظیم ترین اسلامی سلطنت ہیں۔

تیسرا تضاد خود خطبہ سے متعلق ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ خطبہ عربی زبان میں پڑھا جائے اور اس میں وہی الفاظ دہرائے جائیں جو صدیوں سے دہرائے جا رہے ہیں؟ خطبہ حالات حاضرہ پر اجتماع کے مطابق گفتگو ہوتی ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں ہفتہ وار جائزہ ہوتا ہے اور عید کے موقع پر سال بھر کا جائزہ۔ اس میں تضاد یہ ہے کہ عربی میں خطبہ پڑھ کر ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ بات نہیں بنی۔ چنانچہ وعظ کا اس پر اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اس عید پر یہی کچھ ہوا۔ دو خطبے بلکہ خطبہ دو نشستوں میں پڑھا گیا پھر تقریر ہوئی۔ اور چونکہ مسئلہ یہ ہے کہ بغیر خطبہ سنے نماز نہیں ہوتی اس لئے نمازیوں نے خطبہ کا تو انتظار کیا لیکن تقریر کے وقت وہ اٹھنا شروع ہو گئے۔ کیا قرآنی آیات اور ماثورہ دعاؤں کے بعد ایک جامع تقریر سے خطبہ کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر عربی کا رواجی خطبہ کافی ہے تو پھر اس کے بعد اردو میں تقریر کیوں کی جاتی ہے؟

اصل یہ ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، جب کوئی قوم سوچنا چھوڑ دے (جسے قرآن تدبر، تعقل، اور تفکر کہہ کر پکارتا ہے اور جس کی بار بار تاکید کرتا ہے) تو اس کے اعمال حیات اپنے لئے دلی کشمکش کا باعث اور دنیا کے لئے ہنسی کا موجب بن جاتے ہیں۔ دین کے معاملات میں سوچ بچار (تدبر و تفکر) مُلّا بیچارے کے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ اسے شروع ہی سے یہ پڑھایا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کا دخل نہیں اور کسی عمل کی صحت کی سند یہ ہے کہ وہ اسلاف سے اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کے نزدیک، اسلاف کے مسلک سے ذرا سا انحراف بھی جہنم میں لے جانے کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سوچ سمجھ کر صحیح راہ اختیار کرنے سے معذور رہتا ہے۔ لیکن اس میں قصور خود ہمارا ہے کہ ہم نے عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرح، مذہب کو پادریوں اور برہمنوں کی سی ایک جماعت کے سپرد کر رکھا ہے کہ "دنیا دار" مذہبی امور میں دخیل نہیں ہو سکتے۔ اسلام کا دامن اس قسم کی برہمنیت کے عقیدہ سے یکسر پاک ہے۔ خدا کی کتاب ہر مسلمان کے سامنے ہے اور ہر ہدایت کے طالب کو سیدھا راستہ دکھا دیتی ہے۔ اسے لیجئے اور اپنے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اپنی قوم کے لئے راہیں متعین کیجئے تاکہ ان پر چلنے سے ہمارے قلوب سے کشمکش و تضاد کی یہ پھانسیں نکلیں اور ہمارے اعمال صحیح نتائج پیدا کر سکیں۔

⁂

چونکہ اوپر عید کا ذکر آ گیا ہے اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ضمناً عید الاضحیٰ (کراچی) کے اجتماع سے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر کر دیا جائے۔

جہاں تک اس اجتماع کی عمومی فضا کا تعلق ہے وہ چنداں امید افزا نہیں تھی۔ بدنظمی اور بے ضبطی کا وہی پرانا مظاہرہ تھا۔ نمازیوں کا جہاں جی چاہتا تھا آکر بیٹھ جاتے تھے۔ کسی کو تنگی کی صفیں پر کرنے کا خیال نہیں تھا اور کوئی منتظم

ایسا کرانے والا موجود نہیں تھا۔ جب نماز کے لئے لوگ کھڑے ہوئے تو اس وقت منبر سے صدا آئی کہ درمیان کے خلا کو پر کر لیجئے۔ اس وقت خوب افراتفری مچی۔ لوگ آگے جانا بھی چاہیں اور اپنی جگہوں سے ہلنا بھی نہ چاہیں یوں بھی اتنے قلیل وقت میں از سر نو صف بندی ناممکن ہے۔ خیر اسی حال میں نماز شروع ہوئی اور صفوں کے درمیان متعدد خالی جگہیں ملت کی بدنظمی کی افسوسناک شہادت پیش کر رہی تھیں۔

منبر سے یہ بھی اعلان ہوا تھا کہ مکبر مناسب جگہوں پر متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے لئے کیا انتظام کیا گیا لیکن مکبر کسی ضبط و نظام کے ماتحت کام نہیں کر رہے تھے۔ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ ایسے گوشے بھی تھے جہاں کوئی تکبیر کہنے والا موجود نہیں تھا۔

ہم نے عید الفطر کے موقع پر دکھے ہوئے دل سے چند گزارشات کی تھیں۔ دو مہینے اور دس دن میں ان پر کسی نے غور نہیں کیا۔ ہمیں آج بھی وہی کچھ لکھنا پڑ رہا ہے جو اس سے پیشتر ہم لکھ چکے ہیں۔ ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایسے اجتماعات کا خود انتظام کیا کرے۔ صفوں کے نشانات اور ان کے مطابق صف بندی کا فریضہ پولیس یا فوج کے سپرد ہونا چاہیئے۔ وہ دیکھیں کہ نمازی آکر پہلے آگے کی صف پُر کریں اور پھر درجہ بدرجہ پیچھے کی۔ قیام سے پیشتر پوری اور سیدھی صفیں بن جانی چاہئیں۔ اسی طرح لاؤڈ سپیکر کا مناسب و تسلی بخش انتظام ہونا چاہیئے اور اسے نماز میں بھی استعمال کرنا چاہیئے۔ جو لاؤڈ سپیکر نصب کئے جائیں ان کے متعلق اچھی طرح تسلی کر لینی چاہیئے کہ وہ ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ زیر نظر موقع پر بعض لاؤڈ سپیکر کام نہیں کر رہے تھے۔

یہ ایک دل خراش حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں اجتماعی نظم و ضبط نہیں، لیکن یہ از غیب پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے لئے کوشش کرنا پڑے گی۔ ہمارا ہر اجتماع (دینی اور "غیر" دینی) ملی ضبط کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ یوں کام شروع کر دیا گیا تو قوم میں ضبط و نظم پیدا ہو جائے گا، ورنہ تسبیح بے رشتہ کے دانے منتشر کے منتشر رہیں گے۔

مہاجرین کا مستقبل

پاکستان کو روزِ اول ہی جن کڑی اور غیر متوقع مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں ان لاکھوں مہاجرین کی بحالی خاص اہمیت رکھتی ہے جو جرم مسلمانی کی پاداش میں سرزمین ہندوستان سے لٹے اور پٹے ہوئے افتاں و خیزاں پاکستان پہنچے ہیں۔ یہ خانماں خراب اپنی زندگی کا اندوختہ اور بیشتر اپنے اعزہ واقربا درندہ صفت انسانوں کی نذر کرکے آئے ہیں۔ ان لوگوں کو پھر سے آباد کرنے کا کارِ مہم حکومت پاکستان کے سر پڑا۔ ستر لاکھ اجڑے اور اکھڑے ہوئے انسانوں کو بحال کرنا بہت کٹھن کام تھا۔ حکومت نے اس کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے مہاجرین کی بحالی کے لئے ایک علیحدہ مستقل محکمہ قائم کر دیا۔ چودہ ماہ کے عرصہ میں ان مفلوک الحال اور پریشان روزگار انسانوں کو پھر سے مصافِ زندگی میں کھڑا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا گیا؟ اس کی تفصیل مہاجرین کی آبادکاری کے ذمہ دار حکام سے دریافت کیجئے تو وہ اپنے اس کارنامہ کو اعداد و شمار کے رو سے بصد فخر پیش کریں گے کہ اس کٹھن کام کو انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا گیا ہے۔ کاغذی طور پر آپ کو یہ بتایا جائے گا کہ اتنے لاکھ مہاجرین کو دکانیں اور کارخانے دیئے گئے اور اتنے لاکھ کو زمینوں پر آباد کیا گیا۔ ان کے بچوں کی تعلیم اور حفظِ صحت کے لئے یہ یہ اقدامات کئے گئے۔ ضرورت مند اشخاص کو قرضے دیئے گئے وغیرہ وغیرہ۔ آبادکاری کے اس کاغذی کارنامہ کے باوجود آپ کسی مہاجر سے دریافت کیجئے وہ اپنی موجودہ زندگی پر مطمئن نظر نہیں آئے گا۔ وہ اپنی موجودہ گذر اوقات کا موازنہ ان حالات سے کرے گا جب وہ اپنے آبائی ماحول میں مصروفِ کار تھا۔ ہر شخص شاکی ہے۔ جو لوگ اب تک کیمپوں میں سڑتے رہے وہ بھی نالاں ہیں اور وہ بھی خوش نہیں جو فکر معاش کی طرف سے مطمئن ہو چکے ہیں۔ حکومت مطمئن ہے کہ اس نے ستر لاکھ بے ٹھکانہ انسانوں کو آباد کر دیا۔ لیکن خود یہ لوگ، جن کی بحالی کے لئے حکومت کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے، اپنی قسمت کو روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ محکمہ آبادکاری کی اس قدر حقیقی یا مزعومہ تگ و تاز کے باوجود، ابھی ان خانماں خراب متاع بردگان کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو اس حال میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے جس پر انسانیت روتی ہے۔ باہر کے علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے چھوڑیئے۔ خود دارالسلطنت پاکستان (کراچی) میں اس سطحِ مرتفع پر کھڑے ہو کر جہاں معمارِ پاکستان کی آخری آرام گاہ (مزارِ جناح) واقع ہے، دور تک نگاہ دوڑایئے اور دیکھئے کہ آپ کو کس قسم کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اگر محکمہ آبادکاری کے معیار کے مطابق اسی کا نام آباد کرنا ہے تو "برباد" کرنے کے لئے اب یقیناً کوئی نیا لفظ تلاش کرنا پڑے گا۔ ان ننگِ انسانیت جھونپڑیوں کو دیکھئے جن میں دو دو لاکھ

معلوم کل تک کس آرام و آسائش میں رہتے تھے۔ اور پھر اُن محلات کو جن میں وہ حضرات قیام فرما ہیں جن کے حسن کارکردگی کا آئینہ یہ جھونپڑیاں ہیں۔ اور اس کے بعد ان اعداد و شمار کی حقیقت پر غور کیجئے جو ان کی دفتری مشینوں میں ڈھلے ہوئے ان کے لئے وجہ خود فریبی اور قوم کے لئے بمنزلہ عمل تنویم ہوتے ہیں۔

لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر یہ طبقہ نہیں، موضوع سخن اس طبقہ سے متعلق ہے جو قریب قریب ان ہی حالات میں بسائے گئے ہیں جن میں وہ اجڑنے سے پہلے آباد تھے۔ محکمہ آبادکاری کی دفتری مشین پورے طور پر سرگرم عمل دکھائی دیتی ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے جب ہم اس کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبادکاری کا کام ابھی ابتدائی منازل میں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی تک مہاجرین نے پاکستان میں اپنے آپ کو مقیم (Settled) نہیں سمجھا۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ، دوسری جگہ سے تیسری جگہ جاتے ہیں۔ اگر ان کی یہ مضطربانہ تگ و دو محض سہولیات زندگی کی حصول کی خاطر ہے تو وہ انہیں کافی حد تک مہیا کی جا چکی ہیں۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جو ان کی جمعیت خاطر میں حائل ہو رہی ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے آپ کو اس مسئلہ کے اُس پہلو کو سب سے زیادہ نظر میں رکھنا ہو گا جس کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اور جسے اب تک سب سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ انسان کو اپنے گھر بار، جائداد، والدین، اور اعزہ واقربا سے زیادہ اس ماحول سے وابستگی ہوتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کا حصہ یہ سب کچھ ہوتے ہیں اور جس میں وہ اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ گزارتا ہے۔ اس ماحول سے باہر اسے کتنی ہی آسائشیں ہم پہنچا دی جائیں وہ (عام محاورہ کے مطابق) "باہر کے گوشت" کو "گھر کی دال" پر ترجیح نہیں دے گا۔ تعلیم و تربیت کی خامی سے مہاجر مشرق اس معاملہ میں زیادہ "مریض خانہ" (Homesick) واقع ہوا ہے۔ گھر کی عسرت کی زندگی کے باوجود بیرونی دنیا میں ترقی کے مواقع ہمارے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ ماحول کی جذباتی بندشوں نے ہمیں اس حد تک جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ ہم برضا ورغبت ان سے الگ ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان بندشوں کو آپ ایک دو، تین...... گنتے جائیے۔ فہرست طویل ہوتی جائے گی لیکن یہ آخر تک نامکمل رہے گی، کیونکہ اس میں "وہ چیز" نہیں ہو گی جس نے ماحول کی تمام مادی وابستگیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وہ غیر مرئی رشتہ ہے جس نے انسان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی ہوتی ہیں اور جس کی کمی کو وہ ہر جگہ محسوس کرتا ہے۔ اس غیر مادی چیز کو کسی پیمانہ سے ماپا نہیں جا سکتا لیکن یہ پوری قوت کے ساتھ اپنی جگہ موجود ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی عسرت و تنگدستی کے باوصف تسکین قلب کا باعث ہوتی ہے۔

یہی "وہ چیز" ہے جس کی تلاش مہاجرین کو، ہر ممکن دنیاوی سہولیات مہیا ہو جانے کے باوجود، ابھی تک باقی ہے۔ وہ "چیز" کہ جس کی یاد سے ان کے سینے میں ہوک اٹھتی ہے اور وہ بے تابانہ پکار اٹھتے ہیں کہ ؎

وہ زندگی کے سہارے نظر نہیں آتے
کہاں ہیں دوست ہمارے نظر نہیں آتے

انہیں کاروبار میں خاطر خواہ حصہ مل گیا ہے، ان کی رہائش کا مسئلہ امکانی حد تک طے ہو گیا ہے، خاندان کے بقیۃ السیف افراد کی پرورش کا سوال ان کے لئے پریشانی خاطر نہیں رہا، ان کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو چکا ہے، ملازمت پیشہ افراد ملازمت پر بحال ہو چکے ہیں لیکن اُس چیز کے فقدان نے ان تمام سہولیات کو بے حقیقت بنا دیا ہے۔ ہندوستان میں وہ سب کچھ ہو چکنے کے باوجود، جس کی یاد اب تک ان کے دلوں میں تازہ ہے، اگر اب بھی انہیں حالات کے اعتدال کا یقین دلایا جائے تو وہ اپنے اجڑے ہوئے آبائی گھروں کو آباد کرنے میں دلی لذت محسوس کریں گے۔

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جن کا ذکر ہم اوپر سے کرتے چلے آرہے ہیں مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ طبعی ضروریات کی فراہمی کے اعتبار سے حل ہو چکا ہے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن اس حرماں نصیب مخلوق کی نفسیاتی تسکین کا کوئی سامان نہیں۔ اس کارنامہ کی یہی بہت بڑی خامی ہے۔ اس کے لئے ہمیں، یہ دیکھنے کے ساتھ کہ مہاجرین کے آرام و آسائش کے لئے مزید اسباب کی فراہمی کیسے کی جائے، ایسی فضا پیدا کرنا ہو گی کہ وہ اپنے آپ کو پاکستان میں اجنبی محسوس نہ کریں۔ وہ اپنے آپ کو ملتِ پاکستان کا ایک جزو سمجھیں اور جزو لاینفک۔ مہاجر، انصار، پناہ گزین و مقامی کی تفریق فی الفور اڑا دینی چاہیئے۔ ملت کا شیرازہ مذہبی، نسلی، طبقاتی تفریقات سے کافی منتشر ہو چکا ہے، اسے مزید خود ساختہ امتیازات سے اور زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں۔ مہاجر کا جو تصور اسلام کے دورِ اول میں مہاجرین مکہ کی ہجرتِ مدینہ سے ہمارے سامنے آتا ہے وہ ان معنوں سے یکسر مختلف ہے جن میں اس اصطلاح کو آج ہم استعمال کر رہے ہیں۔ مٹھی بھر مسلمانوں کا وہ گروہ، بھیڑوں کا بھاگتا ہوا گلہ نہ تھا جو پناہ کی تلاش میں سوئے یثرب چل کھڑا ہوا تھا۔ مؤمنین کا یہ جیش اپنے نصب العین کی صداقت کا یقین دل میں لئے، عزم و یقین کی دولت سے مالا مال ایک نظم اور عزم کے ماتحت سرزمین مکہ سے نکلا تھا۔ یہ کوئی شکست خوردہ دستۂ فوج نہ تھا جو دشمن کی بے پناہ قوت سے خوفزدہ ہو کر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ اس مختصر سے جیش نے محض اپنا محاذ بدلا تھا اور صرف چند سالوں کے بعد یہ دس ہزار قدوسیوں کی جمعیت کی صورت میں فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوا تھا۔ اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ اس کے بعد مہاجر و انصار کی گروہ بندی کا وجود آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ آج ہم میں انصاری تو موجود ہیں لیکن مہاجر کا شجرۂ نسب وہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ آج 'مہاجر' 'پناہ گزین'، کی اصطلاحات نے ملت کو دو مستقل اور مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مقامی و غیر مقامی مفادات نکھر کر سامنے آ گئے ہیں اور نتیجہ ہے مہاجر و مقامی کی تفریق ٹھنی کا۔ لہٰذا ملت کے فوری اور مستقل مفاد کا تقاضا ہے کہ اس خود ساختہ اور غیر فطری تمیز کو بالکل اڑا دیا جائے۔ ورنہ اس وقت پنجاب میں مہاجر و غیر مہاجر گروہوں کے تصادم سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہو رہے ہیں اس کی وسعت کو ہم روک نہیں سکیں گے۔ اس تصادم کا مظاہرہ ہماری عمرانی زندگی کے ہر شعبے میں ہو گا۔ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ پاکستان کے حصول سے اپنے قومی تجمع کرنے کا جو نادر موقع ہمیں نصیب ہوا ہے وہ بے کار جائے گا اور ہماری قوتیں صرفِ تخریب ہو جائیں گی۔

اس تخصیص کو اڑا چکنے کے بعد ہمیں مہاجرین کی دلجمعی کے لئے ایسا سامان مہیا کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے

موجودہ مقامات کو بھی اپنا گھر سمجھنے لگ جائیں۔ انہیں احساس دلایا جائے کہ وہ ناخواندہ یا اجنبی نہیں۔ پاکستان ان کا گھر ہے ان کے پاکستانی بھائی ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی صورت وہ ہے جس کی طرف طلوع اسلام شروع سے ہی پیہم توجہ دلاتا چلا آرہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حکومت اور عوام میں قیام پاکستان کے بعد جو بُعد اور خلا پیدا ہو گیا ہے اور جو مرورِ وقت کے ساتھ وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے، اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنی معروضات حکومت پاکستان کے متعلقہ حضرات تک پہنچاتے رہے ہیں ان کی مکرر یاددہانی کراتے ہوئے ہم حکومت سے گزارش کرتے ہیں کہ مہاجرین کی دل جوئی کی خاطر اس ضرورت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی دفتر تنہائے مہاجرین کے حکام اپنی کاغذی و دفتری کارروائی نشر کرنے کی بجائے خود ان فلاکت زدہ انسانوں کے پاس جائیں اور محض رسمی دوروں پر اکتفا کرنے کی بجائے ان سے ربط پیدا کریں۔ پیہم دوروں سے اس ربط کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ اُن کی تالیفِ قلوب کے لئے ان سے ہمدردانہ باتیں کریں، اُن کی شکایتیں اور تکلیفیں سنیں، انہیں تسلی دینے کی کوشش کریں اور پھر اپنے عمل و کردار سے انہیں محسوس کرائیں کہ وہ اپنے موجودہ مصائب میں تنہا نہیں بلکہ پاکستان کے سات کروڑ افراد ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ اگر حکومت کے نمائندے اس طرح باقاعدہ ان لوگوں کے پاس جا جا کر ان کی دلجوئی کریں تو ہمیں یقین ہے کہ ان کی افسردگی شگفتگی میں اور ان کی شکست خوردگی حوصلہ مندی میں تبدیل ہو سکتی ہے عوام کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لئے اس سے اچھا ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ارباب حکومت اُن کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کریں۔

دورانِ جنگ میں سرکاری طور پر پراپیگنڈہ پارٹیاں مرتب کی گئی تھیں جو دیہات میں جا کر تقریروں، ڈراموں اور فلموں کے ذریعے لوگوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کا کام سرانجام دیتی تھیں بھرتی کے لئے یہ وسائل بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس قسم کے اجتماعات میں چونکہ تفریح کا سامان کافی ہوتا تھا اس لئے عوام خاصی تعداد میں ان میں شرکت کرتے تھے۔ اگر حکومت پاکستان اور صوبائی حکومتیں اس قسم کی پراپیگنڈا تفریحی پارٹیوں کو پھر ترتیب دے سکیں تو انہیں مہاجرین کی آبادیوں میں بھیج دیا جائے۔ یہ پارٹیاں اسی طرح تقریروں، ڈراموں اور فلموں کے ذریعے مہاجرین کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھانے میں مفید مطلب کام کر سکتی ہیں۔ جنگ کے پراپیگنڈے کے سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عوام اسے ملوکیتی جنگ سمجھتے تھے جس کا اُن کے مفاد سے کم سے کم تعلق تھا۔ اب وہ حجاب بھی باقی نہیں رہا۔ اب انہیں اپنے ملک اور اپنی قوم کے مفاد کے نام پر فوراً ابھارا جا سکتا ہے۔ ہم ان کی توجہات صاف ستھرے پراپیگنڈے کے ذریعے، بے حقیقت دھندلے مسائل سے ہٹا کر اہم وسیع مفادات کی طرف مبذول کرا سکتے ہیں۔ حکومت پاکستان میں اس قسم کا محکمہ موجود ہے۔ یہ کام اس کے کرنے کا ہے۔ نتائج کے اعتبار سے یہ تجربہ اس محکمہ کی دیگر کارگزاریوں سے یقیناً زیادہ مفید — لہٰذا کامیاب ثابت ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی کھیلوں کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں مختلف کھیلوں، ہاکی، فٹ بال، والی بال، کبڈی، کشتی وغیرہ کا باقاعدہ اہتمام کیا جائے اور ان کے لئے

ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اس طریقے سے ان میں مسابقت کا ایک خوش گوار جذبہ پیدا ہوگا اور ان کی مساعی آپس کی کھینچا تانی یا اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں کی نشستوں کے لئے جنگ آزمائی کی بجائے احسن طریق پر صرف ہوں گی۔ وقتاً فوقتاً باقاعدہ مقابلے کرائے جائیں اور ان میں ایسی جاذبیتیں رکھی جائیں کہ ہر ٹیم اور ہر شخص ان میں شرکت اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھے۔ لیکن یہ ٹیمیں مہاجرین اور "مقامیین" کی مخلوط ہوں۔

پچھلے دنوں پنجاب میں مہاجر ارکان اسمبلی کی طرف سے ایک مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ مہاجرین کو ضلع دار آباد کیا جائے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ضلع دار آبادکاری مہاجرین کی نفسیاتی الجھن کا ایک حد تک حل ضرور ہے لیکن چونکہ یہ حل نامکمل ہے اور اس سے بھی مہاجر اور مقامی کا خط تقسیم باقی رہتا ہے اس لئے ہم اس ضلع دار آبادی کی تجویز کے مؤید نہیں، بلکہ اسے ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ اس تجویز کے محرکات بالعموم سیاسی ہیں جن کی تہ میں ہوس اقتدار کارفرما ہے۔ بدقسمتی سے اس تجویز کو بطور ایک سیاسی حربہ اور انتخابی ڈھونگ کے استعمال کیا جا رہا ہے۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ جن جن جگہوں پر مہاجرین آباد ہو چکے ہیں وہاں سے انہیں پھر درہم برہم کر کے سال گزشتہ کے قافلوں کے بھیانک مناظر کی یاد زندہ کرنے کا تصور بھی طبائع گوارا نہیں کر سکتیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک خاندان کے مختلف افراد کی اس فطری اور جائز خواہش کے احترام میں کوئی قباحت نہیں کہ وہ ایک ہی جگہ آباد ہوں۔ اگر بخوشی تبادلہ کے ذریعہ اس قسم کے منتشر افراد کو یکجا کیا جا سکے تو اس سے وہ زیادہ اطمینان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ملازموں کے تبادلہ اور تعیناتی کے وقت اس امر کا لحاظ بھی رکھ لیا جائے کہ ایک مہاجر ملازم کو اس علاقہ میں یا اس کے قریب متعین کیا جائے جہاں اس کے اقارب بستے ہوں تو یہ بھی ایک قابل عمل صورت ہوگی۔ اس طرح کم سے کم تکلیف اور خرچ سے اگر ایک خاندان کے افراد قریب تر ہو سکیں تو اس صورت کی تکمیل کا ضرور اہتمام کیا جائے۔

آخر میں ہم ایک گزارش اپنے ان خوش قسمت بھائیوں سے کرنا چاہتے ہیں جو ایک شب محکومی کے عالم میں سوئے اور صبح کو آزاد فضا میں بیدار ہوئے۔ آپ برسوں تاریخ اسلام کے اس زریں باب پر واہ واہ کرتے رہے جس میں آپ کو مدینہ کے انصار، مکہ کے مہاجرین سے سلسلہ مواخات قائم کرتے ملتے ہیں۔ آپ نے اسلام کی عالمگیر اخوت کا ہمیشہ فخر سے ذکر کیا۔ آپ کرۂ ارض کے دور دراز گوشوں میں آباد مسلمانوں کے درد و کرب پر مدتوں تڑپتے رہے۔ آج آپ کے ستر لاکھ برادران اسلام اپنی متاع زیست کھو کر آپ کے پاس پناہ لینے آئے ہیں یہ ستر لاکھ انسان وہ ہیں جو کل تک جنگ پاکستان میں آپ کے برابر کے شریک تھے۔ ہندوستان کی وسیع سرزمین کی پہنائیوں کو تنگ پا کر وہ پاکستان کے دارالامان میں آ پہنچے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ انصار مدینہ کے عدیم المثال جذبۂ ایثار کے مداحوں میں خود اپنے اندر اس جذبہ کی بو بھی نہیں آ سکی۔ آپ کے دلوں میں اپنے ان لاکھوں بھائیوں کے لئے ہمدردی کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکا۔ بلکہ اُلٹا آپ ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کے وجود کو آپ اپنی [illegible]

ایک خطرہ خیال کرتے ہیں۔ آپ نے انہیں ایک جدا چیز سمجھ لیا ہے جس کا آپ کے گوشت پوست سے کوئی تعلق نہیں۔ آج آپ 'پناہ گزین' کا لفظ طنز اور تحقیر سے استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ کا کردار یہ ہے تو ہر سال سیرۃ النبیؐ کے نام پر رسمی تقاریب منانے سے آپ خدا اور اس کے بندوں کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کریں۔ محمدؐ کے نام پر انگوٹھے چومنے کے بعد اگر آپ ان کی حیات طیبہ سے انصار مدینہ کا جذبۂ ایثار اپنے اندر پیدا نہ کر سکیں تو آپ کو ان کے ساتھ لگاؤ کے نمائشی مظاہرے کو ترک کر دینا چاہیئے۔ ان ستر لاکھ نفوس کا پاکستان پر اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا۔ اگر آپ کو ان کی کسی حرکت پر اعتراض ہے تو ان کی اصلاح اس طریق پر کرنے کی کوشش کریں جیسے آپ اپنے کسی بھائی اور عزیز کی کرتے ہیں۔ ان کی دل جوئی اور جمعیت خاطر نہ ہو سکی تو پاکستان کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ اور اس اضافہ کی ذمہ داری اور عواقب سے آپ بھی بچ نہیں سکیں گے۔ اپنے ان مظلوم بھائیوں کے ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا سامان کیجیئے۔ اتنی بڑی مخلوق کو یوں غیر مطمئن رکھ کر آپ پاکستان کو مضبوط نہیں کر سکیں گے۔ ہم مہاجرین بھائیوں سے بھی عرض کریں گے کہ وہ نئے ماحول سے مانوس ہونے کی کوشش کریں۔ ساری دنیا مسلمان کا وطن ہے اور اس کا کوئی بھی وطن نہیں۔ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت کیجیئے۔ آپ "یثرب" میں آئے ہیں تو "فتح مکہ" کے لئے تیاری کیجیئے! اس کوشش میں انہماک آپ کی افسردگی کو شگفتگی میں بدل دے گا۔

پاکستان کے افسر

مئی کے طلوع اسلام میں ہم نے "جب ہماری حکومت آئے گی تو......" کے عنوان کے ماتحت لکھا تھا۔

اور یاد رکھئے! یہ تبدیلیٔ احوال نہ اس وثیقہ سے پیدا ہوگی جو انگریز کی طرف سے پاکستان کے لئے تمہیں مل گیا ہے اور نہ اُن قوانین و ضوابط سے جو تم مشین کی طرح نافذ کرنا چاہتے ہو۔ بلکہ یہ تبدیلی اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک تمہارے اندر تبدیلی نہ ہو جائے کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

(یقیناً خدا کبھی کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنے اندر نفسیاتی انقلاب پیدا نہ کرے)

اس حقیقت کی روشنی میں جب ہم اپنی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اُس تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے جو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمارے اندر پیدا ہونی چاہیئے تھی عوام کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ کالانعام مشہور ہیں، خواص کی ذہنیت بھی اس عظیم انقلاب کے اثرات سے بیگانہ نظر آتی ہے جس نے ہمیں دو صدیوں کی محکومی سے نکال کر آزاد اقوام کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ عوام میں تحریک پاکستان کی فوری اور ہمہ گیر مقبولیت کا سبب وہ مجلسی خرابیاں تھیں جو بیرونی حکومت کے پیش کردہ نظام سے پیدا ہو چکی تھیں۔ عوام نے ان خوش آیند توقعات کے ساتھ پاکستان کا خیر مقدم کیا کہ اپنی حکومت ان ناگوار مجلسی خرابیوں کو دور کر دے گی۔ لیکن عوام کو اس سلسلہ میں بُری طرح مایوس ہونا پڑا ہے۔

ارباب اقتدار کی "دورباشی" نے ابھی تک عوام کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ملک کی عنان اختیار فی الواقع اپنوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ عوام اور کارپردازان حکومت میں ربط باہمی کے سلسلہ میں ممکن ہے کئی عذر پیش کئے جا سکیں لیکن قیامت یہ ہے کہ خود حکومت کی مشینری کے مختلف پُرزوں میں یہ باہمی ربط مفقود ہے۔ ماتحت و افسر کا امتیاز پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ محترم وزیر اعظم پاکستان کے ان بہ تکرار اعلانات کے باوجود کہ افسران، قوم کے خادم ہیں، ان افسران کی شان حاکمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کی سیرت میں بدلے ہوئے حالات نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ کردار کی اس خامی کے سبب وہ اپنے ماتحت عملہ کا رضاکارانہ تعاون حاصل نہیں کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر دفاتر باہمی چپقلش اور سازشوں کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔

ہمیں وقتاً فوقتاً مختلف دفاتر اور محکمہ جات کے متعلق متفرق شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا عمومی ذکر ہم جون کے طلوع اسلام میں کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں محکمہ فوج سے متعلق چند تلخ حقائق ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ مراسلہ نگار نے انفرادی مثالوں کی بجائے چند عمومی چیزیں پیش کی ہیں۔ مثلاً

۱۔ اکثر افسر اپنے ماتحت عملہ (سپاہی اور جونئر کمیشنڈ افسر وغیرہ) کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں اور دیدہ دانستہ ان کی توہین کرتے ہیں۔

۲۔ انگریزوں کے زمانے میں جن بارکوں میں گوروں کے لئے پنکھے وغیرہ لگے ہوئے تھے، ان میں سے اکثر آرام کی چیزیں نکال لی گئی ہیں۔ وہ افسر کہتے ہیں کہ یہ آسائشیں صرف گوروں کے لئے تھیں، پاکستانی اس کے حقدار نہیں۔ حساس آدمیوں کے لئے یہ ایک توہین آمیز بات ہے۔

۳۔ سپاہی پاکستان کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن افسروں کی یہ حالت ہے کہ بہت کم وقت وہ دفتر میں گزارتے ہیں۔ سپاہیوں کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم قیدی نہیں جو دن رات کام کریں اور ہمارے افسر دفتر میں بھی نہ بیٹھیں۔

۴۔ شراب کا استعمال پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہا ہے۔

۵۔ نماز روزہ اور دیگر شعائر اسلامی سے صرف بیگانگی ہی نہیں بلکہ دلی نفرت ہے۔

یہ شکایات بالکل عمومی ہیں۔ ہم نے قصداً انہیں اس انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ فوج ہی سے مختص نہیں ہیں بلکہ قریباً اسی قسم کی شکایات ہمیں غیر فوجی محکموں کے افسران بالا سے متعلق موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ہم نے انفرادی شکایات کی اشاعت سے عمداً اور مصلحتاً گریز کیا ہے لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اس عمومی انداز سے حکومت کے گوش گزار کر دیا جائے۔ طلوع اسلام کی طرف سے یہ پہلی کوشش نہیں ہے اور مجبور ہیں کہ اس کا اعادہ کریں۔

یہ چند چیزیں ایک جلے دل کی پکار ہیں۔ ان سے محض شعائر اسلامی کی بیحرمتی، افسروں کی فرض ناشناسی اور بارکوں سے پنکھے اتارنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن سے کردار کی اس خامی اور ذہنیت کی اُس خرابی کا اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا ذکر ہم ابتدائی سطور میں کر آئے ہیں۔ زیر نظر مراسلہ اور اس قسم کے دیگر شکایت نامے مختلف افسروں کی انفرادی سیرت کے مظاہر کے خلاف احتجاج کی آواز نہیں بلکہ یہ اس جگر خراش حقیقت کا اظہار ہے کہ حکومت پاکستان کے مختلف عناصر ترکیبی میں بُعد و خلا کی خلیج کس قدر وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اگر محترم وزیر اعظم پاکستان کے اعلانات اس قسم کے افسران کے نام انتباہ کے طور پر نشر کئے گئے ہیں تو اس خلیج کو پاٹنے کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ افسران بالادست کی فرعونیت، ماتحت عملہ کے اس جوش و ولولہ کو بھی ختم کر کے رہے گی جو ناگوار حالات کے باوجود اب تک ان میں باقی ہے۔

پاکستان کے کلرک، سپاہی اور چپراسی آج بھی پاکستان کی خدمت کا زیادہ مخلصانہ جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔ اس جذبہ کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ اُن کے اس احساس کمتری کو دور کیا جائے جو ان کے افسروں نے ان میں پیدا کر رکھا ہے۔

نقد و نظر

ماہنامہ فردوس

مدیر:- محمد واحدی — سالانہ چندہ:- پانچ روپے آٹھ آنے

فی پرچہ — چھ آنے

پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱ کراچی

ہمارے ملی زوال سے جہاں اور شعبوں میں بے راہ روی پیدا ہوئی وہاں شعر و ادب بھی بے زمام ہو گیا اور لطف یہ کہ ہم ادبی اوباش پن کا نام ادبِ لطیف رکھ لیا گیا اور سمجھ لیا گیا کہ محض اس نام سے اس کی تمام کثافتیں، لطافتوں میں بدل گئی ہیں۔ کچھ ارباب ذوق ایسے بھی تھے جو اس ہمہ گیر بے راہ روی کی زد میں نہ بہے اور متانت و سنجیدگی کے مسلک پر گامزن رہے۔ دلی مرحوم کے واحدی صاحب کا شمار انہی میں ہے۔ دلی اجڑی تو ان کی محفل ادب بھی برہم ہو گئی۔ اب آپ کراچی سے "جگر لخت لخت" کو جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ پھر سے ارباب نظر کی "دعوت مژگاں" کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ ان کی اس کوشش کا ماحصل ماہنامہ فردوس ہے جس کے دو پرچے ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ (پہلے پرچہ میں فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں مرتب کی کسی مجبوری کی آئینہ دار تھیں جس کی معذرت انہوں نے دوسرے پرچہ میں کر دی ہے)

ادبی رسالہ پر تبصرہ کے ضمن میں ہم ایک عمومی گزارش ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں شعر و ادب اس وقت معیوب ہو جاتا ہے جب اس کی کیفیت یہ ہو کہ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ یعنی شاعر یا ادیب کے سامنے زندگی کا کوئی متعین نصب العین نہ ہو۔ لہٰذا شعر و ادب میں سب سے پہلا کام تعین مقصد ہے۔ اور ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔ اس لئے ہمارا ادب ہماری زندگی کے اس مقصد متعینہ کی طرف لیجانے کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بے ادبی است

اسلام کا نظریۂ جہاد

(۲)

(حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی)

چونکہ آزاد اسلامی مملکت کا قیام جہاد کا اولین نتیجہ ہے۔ اس لئے جو لوگ محض سطحی نظر سے اشیاء کا مطالعہ کرنے کے عادی ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ آخر جہاد اسلامی اور دوسری اقوام و ملل کی سیاسی اور معاشی جنگوں میں فرق کیا ہے؟ کیونکہ دوسری قومیں بھی سیاسی تسلط و اقتدار اور معاشی مفادات کے لئے کمزور اقوام پر حملہ آور ہوتی ہیں اور ان کی حریت و آزادی کو سلب کر کے ان کی قسمت کی مالک بن جاتی ہیں۔ نیز ان کی جد و جہد کا اولین مقصد بھی یہی کچھ ہے کہ وہ مفتوحہ ممالک میں اپنے مخصوص طرز کی حکومت قائم کر سکیں اور وہاں کے باشندوں کو اپنے وضع کردہ آئین سیاست کی بندشوں میں جکڑ دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلامی تصور زندگی اور نظریہ سیاست کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا وہ اسلامی جہاد کو اقوام دنیا کی جنگہائے زرگری کی فہرست میں شامل کرنے میں ایک حد تک مجبور ہیں کیونکہ ان کی نگاہ کوتاہ بیں کی حد پرواز ہی یہاں تک ہے اور اسلام کا حقیقی فلسفۂ زندگی تا ہنوز ان کی نظروں سے بہت دور ہے۔

تو اے گرد تو ہم شوکت دریا چہ میدانی؟
اسیر عذر لنگی دست صحرا چہ میدانی؟

یہ صحیح ہے کہ اسلام کا اولین اقتضاء یہ ہے کہ نہ صرف کسی ایک ہی خطۂ ارضی میں بلکہ تمام روئے زمین میں مخصوص طرز کی خود مختار اسلامی مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے کیونکہ اسلام جس قسم کے معاشرہ کی تخلیق کرنا چاہتا ہے وہ اسی وقت ممکن ہے کہ ملت اسلامیہ کو دنیا میں کامل سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس حد تک اپنی اجتماعی اور ملی جد و جہد جاری رکھیں کہ تمام مخالف طاقتیں سرنگوں ہو جائیں اور جنگ و قتال کے تمام محرکات و داعیات ختم ہو جائیں

حَتّٰی یَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا (سورۂ محمد)
یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے

مگر دیکھنا یہ ہے کہ آزاد اور خود مختار مملکت کا قیام ہی اسلام کی نظر میں مقصود بالذات ہے یا قیام حکومت

کسی دوسرے اعلیٰ و برتر مقصد کے لئے محض ایک ذریعہ ہے۔ اگر اسلام کا آخری مطمح نظر صرف اتنا ہی مان لیا جائے کہ اس کا نام لینے والے لوگ جن کو مسلم قوم کہا جاتا ہے ساری دنیا پر چھا جائیں اور وہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی طاقتور قوم بن جائیں تو بلاشبہ اسلام کے جہاد ملی اور دیگر اقوام دنیا کی سیاسی اور اقتصادی جنگوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوگا، اور اس صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام کا تصور حیات عصر حاضر کے مادی تصورات زندگی سے مختلف نہیں ہے۔ مگر اسلام کے ماخذ یعنی کتاب و سنت کا گہری اور عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واشگاف ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاد اسلامی سے مقصود بالذات قیام حکومت نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حیات انسانی کا حقیقی نصب العین کیا ہے؟ یعنی سفر زندگی کی وہ آخری حد مقصود کیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کو وہ راحت ابدی اور عیش مسلسل حاصل ہو سکتی ہے جس کی ہر انسان کے دل میں ایک فطری آرزو پائی جاتی ہے۔ یا وہ پاکیزہ اور صالح نظام تمدن، کس طرح بروئے کار آسکتا ہے جو انسان کی صرف مادی خواہشات ہی کی تسکین کرنے والا نہیں بلکہ اس کے قلب و روح کو بھی امن و طمانیت بخشنے والا ہے۔ اور جو حیاۃ طیبۃ اور عیشۃ راضیۃ کی پرامن، خوشحال اور مسلسل زندگی کی نوید دیتا ہے

سفر حیات اور تعیین منزل

ہر با شعور انسان اپنی زندگی کی کئی منزلوں پر یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر اسے کس مقام پر پہنچنا ہے؟ اور اس کی آخری منزل مقصود کیا ہے؟ نیز اسے کونسا قریب تر رستہ اختیار کرنا چاہیئے جو اسے جلد از جلد آخری نصب العین تک پہنچا دے۔ مگر اسلوب فکر کا الجھاؤ اس کے دامنگیر ہو جاتا ہے اور ماحول کی بندشیں اس کی آزادئ فکر کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہیں۔ اب وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر راستہ کی ایک ایک ٹھوکر اسے رجعت قہقری پر مجبور کر دیتی ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو اسی جگہ پاتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب وہ پھر اپنے ہی خانہ ساز اسلوب فکر کی مدد سے کوئی دوسری راہ تلاش کرتا ہے اور اس دفعہ پہلے سے زیادہ عزم و ارادہ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مگر ہوتا کیا ہے؟

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر!

اور یہ "افتاد در بند دگر" کا سلسلہ جاری رہتا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی عقل خودبیں کو عقل جہاں بیں کے حوالے نہیں کرتا، یا نزد و دور اور ہست و بود کی مکانی اور زمانی حدبندیوں کو توڑ کر اپنے تصور زندگی میں بنیادی تبدیلی پیدا نہیں کرتا نیز زندگی کے اس ابدی تصور کے تحت اپنے فکر و ذہن کی اصلاح و تعمیر کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر عقل و شعور میں اس رنگ کی تبدیلی رونما ہو جائے تو حیات انسانی کی کٹھن اور دشوار گزار منزلیں چند لمحوں میں طے ہو سکتی ہیں۔

از شعور است این کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور (اقبالؒ)

آج جس پر امن اور خوشحال زندگی کا تصور اقوام عالم کی جولانِ فکر کا مرکز بنا ہوا ہے اور ہر ذی شعور کو اس کی طلب و جستجو ہے اور بڑے بڑے ارباب دانش و فکر کی مسلسل جد و جہد کے باوجود آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا، وہ کچھ اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اُسے مشکل بنا دیا گیا ہے۔ مگر کوئی چاہے کہ مقصود کو اس کے مبادی کی تکمیل کے بغیر ہی حاصل کر لے تو یہ اس کی حماقت ہے، ہاں اگر منشاء قدرت کے مطابق مقدمات و مبادی کے مراحل خوش اسلوبی سے طے کر لئے جائیں تو گوہر مراد کے عطا کرنے میں قدرت ہرگز بخل نہیں کرتی الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (آیہ)

انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لئے غذا کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اجناس خوردنی کی کاشت سے ان کے جزو بدن بننے تک کئی ایک منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں اور ہر منزل تک پہنچنے کے لئے ایک معین ضابطہ کے تحت کام ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسان کی جو ذمہ داریاں ہیں وہ مقررہ دستور کے مطابق انجام دیتا ہے اور کئی مراحل طے کرنے کے بعد غلہ تیار کر کے منڈی میں لاتا ہے۔ مگر اب تک وہ کھانے کے قابل نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کے پسوانے اور پکوانے کے تمام لازمات مہیا نہ ہوں۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب اسے کھانے کے قابل بنا لیا جاتا ہے تو اس کے کھانے کے بعد بھی یہ جزو بدن نہیں بن سکتا جب تک کہ کھانے والے کے اعضاء رئیسہ اپنے وظائف طبعی کی تکمیل نہ کریں۔ چنانچہ اتنے طویل سفر میں اگر کسی ایک مرحلہ پر بھی فطری اور طبعی اصولوں سے انحراف کیا جائے گا تو اس کے قدرتی نتائج سے بہرحال دوچار ہونا پڑے گا۔ مثلاً کسان کسی غیر صالح زمین میں فصل کاشت کرتا ہے یا زمین تو قابل زراعت ہے مگر فصل بیجنے کے لئے جن لازمات کی ضرورت پڑتی ہے وہ اس کو میسر نہیں ہیں یا فصل بیجنے کے بعد جس قدر محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس سے وہ قاصر ہے تو ان صورتوں میں یا تو غلہ پیدا ہی نہ ہو سکے گا یا مطلوبہ مقدار سے بہت کم پیدا ہوگا۔

اسی طرح غلہ کو پسوانے اور پکوانے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے وہ بہرحال مہیا کرنی پڑتی ہیں ورنہ غلہ کی مطلوبہ خاصیت سے کسی طرح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا ہے اور اکثر حالات میں غذا کا مقصد نہ صرف فوت ہو جاتا ہے بلکہ اس سے جسم انسانی کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا غذا کی تیاری کے بعد آپ اسے تناول کر لیتے ہیں، لیکن جب معدہ و جگر اپنا کام کرنے سے انکاری ہیں تو یہ کھائی ہوئی غذا آپ کے لئے رنجدہ مصیبت بن جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ شروع سے اخیر تک اگر فطری اسلوب کار اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ متذکرہ مفاسد سے آپ کو دوچار ہونا پڑے۔ یہ قدرت کا اٹل اور غیر متزلزل قانون ہے اور سلسلۂ کائنات کی کوئی کڑی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ مادیات و روحانیات، انفس و آفاق اور سفلیات و علویات سب میں ایک طبعی اور فطری نظم و ترتیب ہے اور اسباب و مبادی کا ایک مسلسل اور مربوط نظام ہے جس کی ہر کڑی اپنی جگہ پر قائم اور روز و شب اپنے وظیفہ طبعی کی انجام دہی میں مصروف ہے۔ اگر کائنات کے کسی ایک نظام کے کسی ایک حصہ میں اخلال و فساد رونما ہو جائے تو پورا نظام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً نظام شمسی کے ہمہ گیر اثرات و نتائج کا

ممکن ہے کہ سورج، چاند، ستارے، افادیت و استفادیت اور علیت و معلولیت کے اعتبار سے ایک معین اور مقررہ ضابطہ کے تحت کارفرما ہیں۔ یعنی ہر دوسری کڑی اپنے سے پہلی کڑی سے اپنے آپ کو وابستہ رکھے اور ہر لمحہ اثر و تاثر کا سلسلہ جاری رہے۔

جب کائنات کا ہر نظام مبادی و نتائج کے باہم گہرے اور پائدار ربط کے ذریعہ قائم ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانی نظام تمدن کو اس ہمہ گیر کلیہ سے الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک صالح نظام تمدن کی تخلیق بھی چند مبادی و مقدمات کی محتاج ہے اور جب تک ان مبادی کی تکمیل نہیں ہوتی یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ صالح معاشرۂ انسانی وجود میں آسکے لہٰذا اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اقوام حاضرہ اپنی ارتقائی رفتار کا رُخ بدل ڈالیں اور از سر نو اپنے سفر کا نقطۂ آغاز متعین کریں کیونکہ موجودہ تمدن آج تک جتنی ارتقائی منزلیں طے کر چکا ہے یا آئندہ کرے گا وہ بنا ر الفاسد علی الفاسد ہے۔ اور جب تک وہ اس پوری عمارت کو توڑ پھوڑ کر فکر صحیح کی اساس محکم پر تمدن کی بنیادیں استوار نہ کریں گے معاشرہ کا فساد روز افزوں بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

انسانی جد و جہد کا نقطۂ آغاز یا مبدأ اوّل دل ہے۔ اس کی اصلاح و تربیت حیات انسانی کی نہایت کٹھن اور دشوار مہم ہے۔ مگر اس مہم کے سر ہوتے ہی نجات و کامرانی کی تمام راہیں کھل جاتی ہیں اور انسان میں حیرت انگیز قوت پرواز پیدا ہو جاتی ہے۔

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را (اقبالؒ)

اور مبدأ ثانی مقصد حیات کا تعین ہے۔ جب زندگی کا نصب العین ہی متعین نہ ہو تو سفر زندگی کا رُخ کیسے متعین کیا جا سکتا ہے اور جب سفر کا رُخ ہی متعین نہیں تو دنیا کی وہ کونسی طاقت ہے جو آپ کو منزل مقصود تک پہنچائیگی کیا یہ عقل و شعور کا اقتضا نہیں ہے کہ قدم اٹھانے سے قبل یہ سوچ لیا جائے کہ پہنچنا کہاں ہے اور نقطۂ مقصود کیا ہے؟ اگر آپ یوں ہی اندھا دھند سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کا قدم سمت مخالف کی جانب بڑھتا چلا جائے اور آپ اس خیال میں سرمست رہیں کہ ہم اب منزل مقصود تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ حالانکہ ایک ایک قدم آپ کو منزل مقصود سے دور لے جا رہا ہو!

انسان ابتدا ہی سے اس غلط فہمی میں مبتلا رہا ہے کہ وہ اپنے فہم و شعور کے بل بوتے پر مشکلات زندگی پر قابو پا سکتا ہے، اور وہ اپنی عقل کو ہمیشہ خطاکاری سے بالاتر تصور کرتا رہا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ خود ہی اس نے اپنے لئے نصب حیات متعین کیا اور پھر اس تک پہنچنے کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کیں، سینکڑوں سکیمیں بنائیں، لاکھوں منصوبے گھڑے۔ اور ہر نئی سکیم پر مارے خوشی کے جھومنے لگا، کہ اب تو منزل تک پہنچنے میں دیر نہ لگے گی۔ مگر چند قدم آگے بڑھتے ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ زبان حال سے پکار اٹھا ؎

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

قرآن حکیم نے ان لوگوں کی نسبت ارشاد فرمایا ہے:-

هل ننبئكم بالاخسرين اعمالا۝ الذين ضل سعيهم في الحيوة الدنيا
وهم يحسبون انهم يحسنون صنعًا (آیہ)

کیا ہم آپ کو ان نامراد و خاسر لوگوں کا حال بتائیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی سعی و کوشش صرف دنیوی زندگی میں گم ہو گئی ہے اور وہ اپنے اس طرز عمل کو اچھا سمجھ رہے ہیں!

یہ ہیں وہ بوالہوس جو شیوۂ عاشقی سے نابلد محض ہیں۔ مگر ان کے بلند بانگ دعاوی کو دیکھئے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شوریدہ سری دنیائے عشق میں کوئی بہت بڑا انقلاب پیدا کرنے والی ہے، مگر اندر سے کھوج لگائی جائے تو پیٹ کی کمینہ خواہش یا ہوس اقتدار کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

نازپروردِ تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

گذشتہ ایک دو صدی میں کئی نئے اجتماعی امور عمرانی نظریئے (سوشل تھیوریز) عالم وجود میں آئے اور ساری دنیا میں ان کی منادی کی گئی۔ کہیں نوضویت و اشتراکیت کا چرچا ہے، کہیں فسطائیت (فیسزم) کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اور کہیں جدید جمہوریت (ڈیموکریسی) کو ہر انسانی مرض کا آخری علاج تصور کیا جا رہا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ خدا کی زمین میں مخلوق خدا سے کیا گذر رہی ہے؟ کیا اس کے اصلی دکھ میں کہیں رتی بھر بھی کمی آئی ہے؟ یا کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اگر ان جدید تصورات میں عالم انسانی کے اصل مرض کا علاج نہیں ہے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ شورش و بدامنی بڑھ رہی ہے اور آج بھی بدستور امن و مساوات کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ تو کیا انسان کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ وہ اپنی سابقہ کوتاہیوں کا اعتراف کرے اور فکر صحیح کی بنیادوں پر تمدن صالح کی تعمیر کرے؟

حیاتِ انسانی کا نصب العین

ظاہر ہے کہ انسان کی فطری آرزو جس کا پچھلی سطور میں ذکر کیا گیا ہے زر و جواہر کے خزائن اور ساز و سامان کے ذخائر سے ہرگز تسکین نہیں پا سکتی۔ بلکہ اس تپش کو بجھانے کے لئے کوئی اور ہی آب حیات چاہیئے۔ یعنی انسان کی محبتوں اور چاہتوں کا مرکز وہی چیز ہو سکتی ہے جو اس کی طرح زوال پذیر اور آلودۂ معصیت نہ ہو بلکہ ازلی و ابدی اور معصوم ہو۔ نیز اس کی فضیلت و برتری اس بات میں ہے کہ اس کی زیست محض زیست کے لئے نہ ہو بلکہ اس کی پوری زندگی کسی معصوم و بلند تر مقصد کے لئے وقف ہو

مقصدے از آسماں بالا ترے
دل ستانے، دلربائے، دلبرے

اگر حیات کا مسئلہ ہی انسانی زندگی کا منتہائے مقصود تصور کیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد انسان ہی سے خصوصیت نہیں رکھتا بلکہ وحوش و بہائم کی دنیا بھی یہی مقصد رکھتی ہے۔ اور اس صورت میں انسان کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے حیوانات سے اعلیٰ و برتر تصور کرے۔

مومن کا تصورِ زندگی دنیا کے عام لوگوں کے حیاتیاتی تصورات سے بالکل مختلف ہے یعنی اس کا تعلق نسلی اور معاشی خداؤں سے نہیں ہے بلکہ ذاتِ مطلق سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی شخصیت ایک ہمہ گیر اور عالمی حیثیت رکھتی ہے اور وہ کسی گروہی، نسلی اور جغرافی دائرہ میں محدود نہیں ہے اور نہ محض شہوانی جذبات کی تسکین اور جسمانی راحت کو نقطۂ مقصود قرار دیتی ہے بلکہ اس کی آخری منزل اس تنگنائے عالم سے ورا الورا ہے اور اس کی جنبشِ نظر کے لئے زمین و آسمان کی وسعتیں کافی نہیں ہیں۔ انسانیتِ عظمیٰ کا یہی وہ اعلیٰ مقام ہے جو انسان کو بے شمار روحانی منزلیں طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

تا ابد بوئے محبت بمشامش نہ رسد
ہر کہ خاکِ درِ میخانہ برخسار نہ رفت

دوسرے لوگ جسمانی راحتوں کے لئے زندہ ہیں اور مسلمان کی نظر میں اس حقیر مادی جسم کی کوئی اہمیت نہیں۔[1] یہی وجہ ہے کہ حوادث کے بے پناہ ہجوم میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرتی ہے اور اس کے چہرے سے وقار و تمکنت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کی طلب و جستجو کا میدان پیٹ نہیں بلکہ دل ہے اور اس کا کنہِ مقصود روٹی کے چند ٹکڑے نہیں ہیں کہ وہ معاشی مشکلات سے گھبرا اٹھے بلکہ اس کی جد و جہد کا نقطۂ مرکز ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے اور مومن کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو دوسروں سے اس کو ممتاز کرتی ہے۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او برنتابد ہمسرے

مسلمان جس طرح کے فکر و نظر کا حامل ہے خدا کی زمین میں وہ اسی طرز کا انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کی اولین خواہش ہے کہ شر و فساد کی طاغوتی طاقتوں کو کچل دیا جائے۔ طبقاتی اور معاشی مفادات کے موجودہ ہمہ گیر تصادم سے مخلوقِ خدا کو نجات مل جائے اور غصبِ حقوقِ انسانی اور نامساوات کے تباہ کن مفاسد کے خاتمہ کے بعد تمام انسانوں کو ایک وسیع تر رشتۂ اخوت و مساوات میں منسلک کر دیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ موجودہ

[1] یہ درست نہیں۔ قرآن "جسم" کو بھی کم اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن وہ "جسم" کو مقصود بالذات قرار نہیں دیتا۔ بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ٹھہراتا ہے۔ طلوعِ اسلام

سوسائٹی کو فاسد اور ناپاک عناصر سے پاک کر دیا جائے اور یہ کام ان لوگوں کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے جن کو ایمان و عمل کی قوتیں حاصل ہیں اور اس ساری کائنات انسانی میں اعلیٰ کردار، بے نظیر شجاعت و پامردی، شرف النفس اور بلند اخلاقی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ امیر ہوں یا غریب، تخت شاہی کے مالک ہوں یا لباس فقیر میں ملبوس ہر حال میں ان کا جوہر انسانیت دنیا کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے۔

یزیدك وجهه حسنًا إذا ما زدته نظرًا

جسم ملی کے دو ناسور

موجودہ طریق تمدن اور طرز اجتماع کا فکری اور نظری حیثیت سے اگر جائزہ لیا جائے تو اس کی تہ میں دو متضاد خواہشات نظر آتی ہیں ایک طرف سرمایہ دارانہ جذبات و عواطف انتہائی تیزی سے نشو و نما پا رہے ہیں، اور روح سرمایہ داری اپنی روایتی طبیعت کے ذریعہ غلبہ و تسلط حاصل کرنا چاہتی ہے۔ دوسری طرف دوسرے طبقوں میں اشتراکی ذہنیت اپنا نقش جما رہی ہے۔ یہ دونوں نظریے صرف پاکستان اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں باہم نبرد آزما ہیں اور ملت پاکستان خصوصیت سے اس نظریاتی جنگ کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ مگر کچھ لوگ اشتراکیت کے نام سے اس قدر خائف ہیں کہ وہ اس کی نسبت سرمایہ داری کے جبر و تشدد کو ھون البلیسین تصور کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اشتراکیت نے اپنی لادینی حیثیت کو بالکل عریاں کر دیا ہے۔ مگر سرمایہ داری سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مذہب کا لبادہ اتار کر اپنے ذہنی نقوش کو اجاگر کر دے، کیونکہ اس کی زندگی کا سہارا ہی دین و مذہب کی نمائش ہے۔ چنانچہ سرمایہ دار دنیا کی ہمیشہ سے یہ فطرت رہی ہے کہ جب بھی اس کے کاسۂ سر پر کوئی نئی ضرب لگتی ہے تو یہ چیخ اٹھتی ہے اور جھٹ کوئی نیا لباس بدل کر سامنے آجاتی ہے اور بالعموم دین و مذہب کا جامۂ تورع زیب تن کر کے اور شریعت کی علمبردار بن کر مخالف قوتوں کو شکست دینے کی سعی کرتی ہے۔ اور حقیقت میں دین و مذہب سے اس کو اتنی نسبت بھی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے مخالف کو ہوتی ہے۔ مگر وہ جانتی ہے کہ دین و شریعت کے آہنی لباس کے سوا اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہایت معصومانہ انداز میں دنیا کو باور کرانا چاہتی ہے کہ دوسرے لوگ مذہب و دین کو مٹانا اور زندقہ و الحاد کو ابھارنا چاہتے ہیں اور عام لوگ اس کے معصومانہ طرز تکلم اور منافقانہ لباس تورع سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ ان ملحد اور بے دین لوگوں سے زیادہ رندانہ صفت سرمایہ دار مذہب و دین کا دشمن ہے۔ مگر اس کا طریق رندی الگ ہے۔

اے دل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست است در حق او کس ایں گماں ندارد

یہ حقیقت ہے کہ سرمایہ دار کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ جلب دولت، ناجائز نفع اندوزی اور غصب حقوق

انسانی ہے۔

اشتراکیت اپنے ظواہر کے اعتبار سے نہایت خوبصورت اور دل کش ہے مگر معنوی اور افادی حیثیت سے نظام سرمایہ داری سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ یعنی اس کی لادینی حیثیت سے قطع نظر کر کے اگر صرف معاشی نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معاشیات انسانی کی الجھن کو حل کرنے سے نہ صرف قاصر ہے بلکہ اور زیادہ الجھنیں پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اشتراکی نظام کسی پائدار اور محکم اساس پر مبنی نہیں ہے اور اس کی اصولی حیثیت انسانوں میں صرف معاشی مساوات پیدا کرنا اور مادی تقاضوں کی تکمیل ہے۔ کوئی پاکیزہ اور معصوم تصورِ زندگی اس کے پیش نظر نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سامنے کوئی مثبت پروگرام ہے

کردۂ کار خداوندان تمام — بگذر از لا جانب الا خرام
اے کہ می خواہی نظام عالمے — جستۂ او را اساس محکمے
داستان کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از ام الکتاب (اقبال)

نیز حیاتِ انسانی کے اجزائے ترکیبی میں جو قدرتی ربط و نظم ہے اشتراکیت کی ہوس پرستانہ تحریک نے اس کے تار و پود بکھیر دیئے ہیں اور صرف پیٹ کے مسئلہ کو مدارِ زندگی قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ حیاتِ انسانی کا محض ثانوی مسئلہ ہے۔

غرض نظام سرمایہ داری (کیپٹیل ازم) ہو یا نظام اشتراکیت (سوشلزم) اصولی اور افادی حیثیت سے دونوں لعنت ہیں اور انسانیت کے بدترین دشمن!

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ اسلام کا تصورِ زندگی عصر حاضر کے مادی تصورات سے بالکل الگ ہے اور وہ صرف انسان کی دنیوی اور مادی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک دوسری ابدی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ یعنی اسلام اس زندگی کے لئے حیاۃً طیبۃً (پاکیزہ اور پرامن زندگی) کا وعدہ کرتا ہے اور اخروی زندگی کے لئے وہ عیشۃ راضیۃ (پسندیدہ اور مرغوب زندگی) کا مژدہ سناتا ہے۔

اسلام کا تصورِ سیاست

اسلام کا نظریۂ حکومت و سیاست بھی اس اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی نظریۂ حیات کے تابع ہے۔ یعنی اسلام میں اقتدار و حکومت محض سیاسی تسلط اور معاشی تفوق کے لئے نہیں ہے بلکہ چند ہمہ گیر اصول زندگی کے احیاء اور امانت دین کے لئے ہے۔ ملت اسلامیہ کی حیثیت حاکمہ اس امر کی مکلف ہے کہ وہ اپنے تمام ملکی کاروبار کو ان متعین اخلاقی قدروں کا پابند بنا دے جو اسلام کی

نے اس کے لئے مقرر کی ہیں۔ اور اس خدائی ضابطۂ سیاست سے سرِ مو بھی انحراف نہ کرے۔ گویا اسلامی مملکت میں ہیئتِ حاکمہ کا ہر رکن اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے اعمالِ حکومت میں مطلق العنان نہیں ہے بلکہ اسے ایک ایک حرکت کے لئے جوابدہ ہونا ہے۔ ولنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین (آیہ)

چنانچہ اسی تصورِ مسئولیت عامہ کی اساس پر اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں کسی طرح کے ظلم و تعدی، غصب حقوق، قتل و غارت اور انسان کشی کے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہر انسان انسانیت کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ کیونکہ جو قوت مقتدرہ رب العلمین کے منشاء کے مطابق اس کی زمین میں حکومت کا کاروبار چلاتی ہے وہ کسی طرح اس کے بندوں کیلئے زحمت نہیں ہو سکتی بلکہ سراسر رحمت ہوتی ہے اور ایسی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا کسی طرح مذموم نہیں ہے بلکہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ . . . . (سورۂ حج)

(ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جاتی ہے، جہاد کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ (جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے) وہ لوگ ہیں جن کو ناحق گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ صرف اس جرم میں کہ وہ "ربنا اللہ" کہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی صالح جماعت کے ذریعہ ظالم اور بدکردار لوگوں کی دست درازیوں کی مدافعت نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم کردی جاتیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ طاقتور اور غالب ہے۔ یہ لوگ (جن کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے) وہ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں غلبہ عطا کریں گے تو وہ نماز پڑھیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور لوگوں کو نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور انجام تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

اس نصِ قرآنی سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام و انصرام کے لئے

ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو منصبِ حکومت کو ذاتی منفعت کا ذریعہ نہ بنائیں۔ بلکہ مخلوقِ خدا کی صحیح رہنمائی کا حق ادا کریں۔ یعنی برائی کو مٹانے اور نیکی کو ابھارنے کے لئے حکومت و مملکت کے تمام ذرائع تحریک دیں اور اس جہادِ زندگی کو اس وقت تک جاری رکھیں کہ برائی کی تمام طاقتیں مٹ جائیں اور عالمِ انسانی خیر و برکت کے مقدس نور سے ہمکنار ہو جائے۔ چنانچہ متذکرہ آیات میں غور کرنے سے یہ حقیقت خود ہی واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے قدوس نے مسلمانوں کو اس شرط پر جہاد کی اجازت دی ہے کہ وہ کاملاً آزاد و خود مختار ہونے کے بعد خیر و شر کے اخلاقی تصورات کے تحت حکومت کا نظم و نسق چلائیں اور ان کی اجتماعی اور ملی طاقت نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہو یعنی ملتِ حنفی ان اقوام و ملل کی طرح جو صرف اپنی محدود قومیتوں کے سیاسی غلبہ اور معاشی تفوق کے لئے برسرِ پیکار رہتی ہیں، محض اپنے جماعتی یا قومی اقتدار کے لئے جد و جہد نہیں کرتی بلکہ اس کی نظر انسانیتِ مطلقہ کی فلاح و نجات پر ہوتی ہے کہ اس کو "اخرجت للناس" کے عمومی منصبِ امامت و قیادت سے مخصوص کیا گیا ہے۔

گفت آں کلیمِ خویش بدریا برد ز موج
ویں سعی می کند کہ برآرد غریق را

نیز ان آیات میں اذنِ جہاد کا حقیقی داعیہ بھی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ اگر انسانوں کی یہ مقدس اور سرفروش جماعت جہاد کے ذریعہ ظالم اور شریر عناصر کی سرکوبی نہ کرتی تو انسانیت کی سب سے زیادہ قیمتی اور مقدس متاع بھی ان شریر النفس انسانوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتی۔ یعنی انسانوں کے معابد اور مقاماتِ مقدسہ بھی منہدم کر دیئے جاتے۔ مگر خدائے قدوس چاہتے ہیں کہ صالح افرادِ انسانی کے ذریعہ بدکردار اور ظالم انسانوں کو ختم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لئے رب العالمین نے ملتِ حنفی کو منتخب کیا ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ سمجھ لینا آسان ہو گا کہ جہادِ اسلامی اقوامِ حاضرہ کی خود غرضانہ قومی جنگوں کی طرح بہیمانہ لڑائی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک مقدس اصولی جنگ ہے جو نوعِ انسانی کو اس کے اعلیٰ نصب العین سے آشنا کرنے اور انسانیت کی متاعِ گراں کے تحفظ اور عالمِ انسانی میں ہمہ گیر امن و مساوات قائم کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے چونکہ ان کی تہ میں محض مادی انتفاع کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور وہ بھی انسانیتِ عامہ کیلئے نہیں بلکہ محض ایک جغرافی قوم یا کسی خاص انسانی فرقہ سے مخصوص ہوتا ہے اس لئے اس نوعیت کی جنگیں بھی جہادِ اسلامی سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں کیونکہ جہاد کی تہ میں ایک ہمہ گیر اور لامحدود جذبۂ آزادی و حریت کارفرما ہے۔

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است (اقبالؒ)

(باقی آئندہ)

بقیہ نقد و نظر

اسلام کے مشہور امیر البحر

مصنف عبدالواحد سندھی ضخامت :- ۳۹۲ صفحے قیمت :- دو روپے بارہ آنے

ملنے کا پتہ سرسید پبلشنگ ہاؤس کراچی

سندھی صاحب کی کتاب " اسلام کے مشہور سپہ سالار " کا تعارف طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں کرایا جا چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس مفید سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔ شروع میں جہاز رانی کی اہمیت کو قرآن کریم کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ پھر اس باب میں مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف ہے اس کے بعد مشہور امیر البحروں کا تذکرہ۔ کتاب دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ ہمارے خیال میں اسے پاکستان کے جنگی بیڑے کے اسکولوں میں بالخصوص اور دوسرے مدرسوں میں بالعموم بطور نصاب مقرر ہو جانا چاہیئے۔ اسے آپ بھی پڑھئے اور بچوں کو بھی پڑھائیے۔

Muslim League Yesterday and Today
مسلم لیگ کا ماضی و حال

مصنف :- اے۔ بی۔ راجپوت۔ ضخامت : تین سو صفحات قیمت :- آٹھ روپے۔

ناشر :- شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

مسلم لیگ کے ماضی و حال کے متعلق یہ کتاب برِعظیم ہند و پاکستان کے گزشتہ ۵۰ سالہ واقعات پر ایک تاریخی تبصرہ ہے۔ مرتب کے الفاظ میں " یہ دس کروڑ مسلمانوں کی اس قوم کی اجمالی تاریخ ہے جو سو سال کے عرصہ میں مفتوح ہو کر کھو گئی اور پھر نمودار ہوئی "۔ ابتدائی ابواب میں اس الزام کی تردید میں تاریخی شواہد (مفصلاً) پیش کئے گئے ہیں کہ مسلمان بیرونی اقتدار کے حامی ہیں۔ کانگرس کی پیہم حماقتوں نے برِعظیم کو جس سیاسی ابتلاء سے دوچار رکھا، کتاب کے باقی ابواب اس کی تاریخ ہیں۔ اس سلسلہ میں پیش آنے والے واقعات کو ترتیب وار جمع کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک مفید مجموعہ ضرور ہے لیکن اسے موضوع پر اضافہ نہیں کہا جا سکتا۔

فاضل مرتب نے اصل میں جن بیرونی قارئین کے لئے یہ کاوش کی تھی ان کی دلچسپی کیلئے اس میں بہت کم مواد ہے۔ جارحانہ ہندو ذہنیت کے مظاہرے اور مسلم قومیت کے عروج کے ساتھ بیرونی متعلم سیاست کو یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ ہندی سیاست کا رُخ خواہ کچھ ہوتا مسلمانوں کا جذبۂ علیحدگی آشکار ہو کے رہتا۔ اس جذبۂ علیحدگی کا سبب، جیسے ہنگامی واقعات و حوادث جلد سطح پر لے آئے، ہندو کی جارحانہ ذہنیت نہیں بلکہ وہ فطری خصائص ہیں جو ملتِ اسلام کو دوسری ملل سے ممیز کرتی ہیں۔ مسلمانوں کے ملی مزاج کا تقاضا یہی تھا جو پورا ہو کے رہا۔ اس کے سوا ہر صورت غیر فطری، لہٰذا غیر مستقل ہوتی۔

ہندوستانی سیاست کا تجزیہ

(بین الاقوامی سیاست کی روشنی میں)

ہندوستان کچھ عرصہ سے اپنی امن خواہی اور امن پسندی کا خصوصیت سے ڈھول پیٹ رہا ہے اُس کی ہزاروں زبانیں اور اُس کے لاکھوں قلم کرۂ ارض کے اہم مقامات سے دنیا بھر کو یہ یاد کرانے میں ہر وقت مصروف ہیں کہ ہندوستانی ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں امن اور محض امن کے خواہاں ہیں۔ یہ مساعی اُس دن سے اور زیادہ تیز ہوگئیں جب سے اُسے معلوم ہوا کہ حیدرآباد نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ہندی حیدرآبادی مقدمہ کو اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش کرے گا۔ اس کے ساتھ دولتِ مشترکہ کی مؤتمر وزرائے اعظم کا اجلاس بھی شروع ہوگیا جس میں پنڈت نہرو کو بحیثیت وزیرِ اعظم ہندوستان شریک ہونا تھا۔ اس حرکت کے پیشِ نظر اپنے حق میں فضا سازگار کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نہرو نے ایک طرف حیدرآباد کی آزادی سلب کی اور مگے ہاتھ پاکستان کو بھی جنگ اور حملہ کی دھمکیاں دیں اور دوسری طرف دنیا کو اس فریب میں مبتلا کرنا شروع کیا کہ ہندوستان امن کا دیوتا مہاتما گاندھی کا پجاری ہے۔ اُس کے منہ میں ہر وقت رام رام رہتا ہے اس سے نہ پاکستان کو ڈرنا چاہیئے نہ دیگر ممالک کو۔ البتہ ہندوستان کو پاکستان سے جنگ کا اندیشہ ہے، کیونکہ اس نے کشمیر میں اپنی فوجیں بھیج رکھی ہیں جو ہندوستان کا حصہ ہے لہٰذا ہندوستان خائف ہے۔ نیز اس کے اخبارات ہندوستان کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں حالانکہ ہندوستان کے اخبارات ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں حکومت کی طرف سے ہدایات دیدی گئی ہیں کہ وہ ایسی حرکات کے مرتکب نہ ہوں[1]۔

---

[1] حکومتِ ہند نے ۲۸ اکتوبر کو ایک پریس اعلامیہ میں حوالے دے دے کر ثابت کیا کہ پاکستانی اخبارات ہندوستان کے متعلق مبالغہ آمیز اطلاعیں شائع کرتے ہیں اور شدید الفاظ میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے اس کا جواب ۵ نومبر کے اعلامیہ میں دیا۔ اس اعلامیہ میں ہندوستانی اخبارات کے حوالے دیئے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہاں پاکستان اور قائدینِ پاکستان کو کس کس انداز سے گالیاں دی جاتی ہیں۔ یہ موازنہ تو فریقین کی طرف کے اقتباسات دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ کدھر کے اخبارات کا رویہ نامناسب تر رہا ہے لیکن پاکستانی اعلامیہ میں ایک بات دلچسپ یہ ہے کہ ہندوستانی اعلامیہ میں پاکستانی اخبارات کے جو حوالے دیئے گئے ہیں ان میں سے بعض مذکورہ اشاعتوں میں موجود نہیں بعض ہی نہیں بلکہ ہندوستانی حکومت نے یوں بھی کیا ہے کہ پاکستان میں شائع شدہ اطلاعات کو اپنے معنوں میں لیا ہے اور یوں دنیا کو ایک دھوکہ اور فریب میں مبتلا کرنا چاہا ہے۔ تعجب ہے کہ حکومت (باقی ص ۶۳)

یوں تو تقسیم کے وقت سے ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایسے متعدد نزاعات پیدا ہو گئے تھے جو کسی بین الاقوامی ثالث کے نزدیک ہندوستان کے ڈھول کا پول کھولنے کے لئے کافی تھے۔ مثلاً ہندوستانی ریاستوں، مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کا منظم سازش کے ماتحت قتلِ عام، پاکستان کے جنگی ساز و سامان کو روکنا بلکہ روکے رکھنا (ابھی تک پاکستان کے حصّہ کا معمولی جزو پاکستان بھیجا گیا ہے) پاکستان کے سرمایہ کو روکنا اور بہ لطائف الحیل ادائیگی کو ٹالنا، جوناگڑھ پر قبضہ، کشمیر کا الحاق وغیرہ حیدرآباد کے معاملہ میں گو پاکستان براہِ راست دخیل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن آئین و انصاف کی رو سے اس کا احتجاج قابلِ تسلیم ہے۔ یہ اور دیگر غیر معمولی مشکلات جو ہندوستان نے پاکستان کے لئے پیدا کیں محض اس لئے تھیں کہ جس پاکستان کو انہوں نے بطیبِ خاطر قبول کیا ہے اُسے ناممکن العمل بنائیں۔

اس وقت اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل کے جیرِ بحث ہیں، یہ تمام امور شامل ہیں جس مسئلہ کو ان پر فوقیت سبقت حاصل ہے وہ کشمیر کا مسئلہ ہے کشمیر جغرافیائی، اقتصادی، تمدنی نقطۂ نگاہ سے پاکستان کا حصّہ ہے کشمیری آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے لہٰذا اُن کی غالب اکثریت پاکستان سے الحاق چاہتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلمانانِ کشمیر ہندوستان سے ملحق ہونا پسند کریں۔ کشمیر کا الحاق انہی امور سے فیصل ہو سکتا تھا لیکن ہندوستان نے کشمیر پر ڈاکہ ڈالا۔ دہلی اور لندن کی ملی بھگت نے سر رٹ جمیں اور ریڈکلف کے ہاتھوں مشرقی پنجاب کے مسلمان علاقے بھی ہندوستان کو دلا دیئے تھے اور یوں ہندوستان اور کشمیر کا براہِ راست تعلق پیدا کر دیا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہندوستانی فوجیں کشمیر میں جمع کر دی گئی تھیں۔ تقسیم پنجاب سے ہندوستان اور کشمیر کا براہِ راست زمینی ربط پیدا کر دیا گیا۔ اگر پنجاب کی تقسیم حق و انصاف اور آبادی کے مطابق ہوتی تو کشمیر۔ ہندوستان کے کشمیر کے الحاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ غیر مسلم راجہ اور غدارِ عبد اللہ اس سازش کو مکمل کرنے کے لئے موجود تھے جس کا تانا بانا دہلی میں تیار ہو رہا تھا۔ چنانچہ اہلِ کشمیر نے ڈوگرہ مظالم سے تنگ آکر جب آخری مرتبہ جنگِ آزادی کی طرح ڈالی تو مہاراجہ نے اپنا اقتدار جاتا دیکھ کر فوراً ہندوستان سے استمداد کی۔ یہ پروگرام پہلے سے مرتب تھا۔ عبد اللہ کو تلاش کر کے وزیرِ اعظم بنا دیا گیا اور ہندوستان نے اعلانیہ جنگ شروع کر دی۔ عبد اللہ کو وزیرِ اعظم بنانے سے دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالنا مقصود تھا کہ کشمیر میں عوامی حکومت قائم کر دی گئی ہے، لہٰذا آزاد کشمیر حکومت ناخواندہ اور غیر ضروری ہے۔

عبد اللہ، وزیرِ اعظم کو حکومتِ کشمیر میں کیا دخل ہے یہ خود عبد اللہ کی زبان سے سنئے۔ ۲۹ ستمبر کو نئی دہلی میں تقریر کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

مہاراجہ سارا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے ..... ریاستی افواج کا

(بقیہ ص ۴۳) پاکستان سے والوں کو بعض اخبارات تک محدود رکھا ہے حالانکہ ہندوستان کے ارباب حکومت کے بیانات میں اس سے زیادہ قابلِ اعتراض (اور دلچسپ) اقتباسات مل سکتے تھے۔

انتظام انہی کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس لئے یہ اختیار ابھی تک ہمارے سپرد نہیں کیا۔ مہاراجہ کی فوج جو ہے کی فوج نہیں ہے۔ وہاں بیٹھی اسی کے رشتہ دار بھرے بیٹھے ہیں۔ کسی اور کو نزدیک نہیں آنے دیا جاتا۔

اس اعترافِ جرم سے نہ صرف عبداللہ کی وزارتِ عظمیٰ کی اصلیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے، کہ مہاراجہ نے اپنا کتنا اقتدار ہاتھ سے چھوڑا ہے، اور "جمہور" کے سپرد کیا ہے۔ مہاراجہ ہندوستان کے ماتحت ہے۔ اور عبداللہ ہندوستان کا زرخرید غلام ہے۔ اسے حقیقی اختیارات سونپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اس کا یہ مطالبہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ تو اپنے قول کے مطابق ہندوستان کی سیاسی جنگ لڑنا چاہتا ہے۔ جو اقتصادی موثرات سے لڑی جائے گی۔ چنانچہ حال کی تقریر میں اس نے ہندوستان کو دہائی دی۔ کہ اقتصادی طور پر ہمیں "تنہا" نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ ان حالات میں اہلِ کشمیر کی آزادی خواہی اور آزادی طلبی قدرتی اور قابلِ فہم ہے۔ ان کے نزدیک مہاراجہ اور عبداللہ کا دور، غیر کی آمد و رفت سے زیادہ وقیع نہیں۔ ان پر ظلم و استبداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ سکھوں اور سیوک سنگھ کی باقاعدہ آمد سے ان کی زندگی اور اجیرن ہو گئی ہے۔ اور عزت اور ناموس خاک میں مل رہے ہیں۔

اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے مابین جو کشیدگی پائی جاتی ہے۔ اس کا بہت حد تک ذمہ دار کشمیر ہے۔ لیاقت علی خاں اور پٹیل نے حالیہ تقریروں میں وضاحت سے کہہ دیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی دوستی کا انحصار کشمیر کے تصفیہ پر ہے کشمیر درحقیقت وہ علامت ہے جس کی علت بہت گہری ہے ہم اس علت پر آئندہ سطور میں تبصرہ کریں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ کشمیر کا معاملہ اہلِ کشمیر کی خواہشات کے مطابق طے ہو جائے، تو یہ کشیدگی بہت حد تک کم ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا دھیمے دھیمے اور سہج سہج طے ہو رہا ہے، کہ تصفیہ سے متعلق حسنِ ظن قائم نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان کو یوں تو خیال تھا۔ کہ کشمیر کی کوشش اس کے استقبال کے لئے وا ہو گی۔ اور اگر معاملہ حد سے بڑھتا نظر آیا تو وہ آنکھیں دکھانے پر خاطر خواہ عمل آمد کرا لیں گے۔ لیکن اہلِ کشمیر اور قبائلِ آزاد نے جس سرفروشی اور جرأتِ ایمانی سے جنتِ کشمیر کو اپنے خون سے لالہ رنگ کیا۔ اس نے ہندوستان کے چھکے چھڑا دیئے۔ چنانچہ ہندوستان کی آنکھیں کھلیں۔ اور اس نے معاملہ اقوامِ متحدہ کے سپرد کر دیا۔

ہمیں جمعیت اقوامِ متحدہ کی ہیئت اور طریقِ کار سے متعلق اصولی اختلافات ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے۔ کہ جب تک اس جمعیت کی اساس نہیں بدلے گی۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی تعمیری صورت مضمر رہیگی۔ اور اس کی ناکامی مقدر رہے گی۔ اس جمعیت نے اپنے پیش رو اور اندازِ کارکردگی سے متعلق جو لفظی دعاوی باندھے ہیں۔ وہ ان پر کبھی پوری نہیں اتر رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے مذاکرات اور فیصلے اگر انہیں فیصلے کہا جا سکتا ہے تو اقوامِ عظمیٰ کے استعماری اغراض و تصادم کا آئینہ ہوتے ہیں اس نے جس طریق سے مقدس فلسطین کو بانٹنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کی موت کا ضامن ہے۔ اس کے تدبر و فیصلہ کا دوسرا امتحان پاکستانی ہندی مقدمہ تھا۔ یہاں بھی اس نے افلاسِ تدبر کا ہی ثبوت دیا ہے۔ یہاں تک کہ دولِ صغریٰ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہیں کہ کیا اس ادارہ سے وابستگی ان کے لئے واقعی ضروری اور مفید ہے۔ یہ عدمِ اطمینان قدرتی ہے۔ دولِ صغریٰ مجبور و بے بس ہیں۔ وہ انصاف کی توقع کھو چکی ہیں۔ دنیا دو مخالف فریقوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک طرف روس ہے۔ اور دوسری طرف امریکہ۔ جمعیت اقوامِ متحدہ ان دو طاقتوں کا میدانِ جنگ ہے۔ دولِ صغریٰ ان دو بے بس کھلاڑیوں کے مابین گیند کی مانند ہیں۔ کیا وہ متحد ہو کر اس بین الاقوامی بازی گاہ میں کھلاڑی کی حیثیت حاصل کر سکتی ہیں؟

نیز حفاظتی کونسل میں ہندوستان نے خصوصیت سے اس

امر پیش رو دیا۔ کہ کشمیر کی صورتِ حالات امنِ عامہ کے لئے خطرہ ہے۔ لہٰذا اس کا فوری تصفیہ ہونا چاہیئے۔ اس کے جواب میں جب پاکستانی وزیرِ خارجہ نے وہ سارا پس منظر بیان کیا جس کا ایک گوشہ کشمیر ہے۔ تو حفاظتی کونسل مجبور ہو گئی کہ وہ ہندی پاکستانی نزاع کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے۔ چنانچہ حفاظتی کونسل کی ۲۱ اپریل کی قرارداد میں ایک کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا۔ جو پاکستان اور ہندوستان کا دورہ کرے اور حالات کا بچشمِ خود ملاحظہ کرے۔ مسئلہ کشمیر کی نزاکت اور اہمیت کے پیشِ نظر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کشمیر کے قضیہ کو پہلے نپٹایا جائے۔ کمیشن نے دو مملکتوں کے نمائندوں سے ملکر بالآخر ۱۳ اگست کو "التوائے جنگ" کی قرارداد دونوں حکومتوں کے روبرو پیش کر دی۔ یہ موقع اس قرارداد کی جزئیات پر بحث کرنے کا نہیں۔ ہم اس وقت صرف سرسری جائزہ لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اجمالاً کہا جا سکتا ہے۔ کہ کمیشن مذکورہ نے جس پر حفاظتی کونسل نے یہ فریضہ عائد کیا تھا۔ کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ استصوابِ رائے کے لئے ایسی فضا تیار کرے۔ کہ ریاست کشمیر و جموں، پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کر سکے۔ اس کی ۱۳ اگست کی قرارداد باعتبار نتائج یہ ہے۔ کہ کشمیر کو بطور تحفہ ہندوستان کے پیش کر دیا گیا ہے۔ اور پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ وہ بیک جنبشِ دو گوش کشمیر و جموں کی ریاست سے نکل جائیں۔ اس ضمن میں اس مذاق کو نہ بھولئے کہ حفاظتی کونسل کشمیر کے قضیہ کو اس اہمیت کے پیشِ نظر زیرِ بحث لاتی ہے۔ کہ اس سے امنِ عامہ کو فوری خطرہ ہے۔ وہ ایک کمیشن کو اسی پر مامور کرتی ہے۔ اس کمیشن اس کا معترف ہے۔ لیکن ان کے نہاں خانۂ دماغ سے التوائے جنگ کی جو قرارداد ابھرتی ہے۔ وہ بیش ازیں نہیں کہ التوائے جنگ پر فوری عمل درآمد کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس اصول کو پاکستان اور ہندوستان تسلیم کر لیں۔ اور باہمی مشاورت و مذاکرات سے تاریخ اور دیگر تفصیلات کا تعین کر لیں۔ یہ تو خیر ہوا اس عجلت کا جس پر کم و بیش نو مہینے قیمتی جیسے ضائع ہوئے۔ اب ادھر کمیشن نے پاکستان اور ہندوستان کے روبرو اپنی تجویز پیش کی۔ ادھر وہ عازمِ جنیوا ہو گیا۔ کہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شرکت کرے۔ اب اس کی مراجعت کوئی چھ ہفتوں کے بعد ہوگی۔

کشمیر کا تصفیہ دو طرح ہو سکتا ہے۔ ایک طریقہ جنگ کا ہے۔ اور وہ یہی ہے۔ کہ موجودہ جنگ جاری رہے۔ تاآنکہ یا آزاد کشمیر اسے بزورِ شمشیر فتح کرے۔ یا ہندوستان اس پر زبردستی قبضہ کرے۔ اس صورت میں حالات کو اپنی موجودہ روش پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وقت اس کا فیصلہ کر دے گا۔ دوسرا ذریعہ حل پُرامن ہے۔ اقوامِ متحدہ کے مسئلہ کشمیر کو ہاتھ میں لینے کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے۔ کہ اسے کشمیر کا پُرامن حل مطلوب ہے۔ پُرامن حل کا قدمِ اوّل یہ ہے کہ جنگ فی الفور بند کرا دی جائے۔ اور اہالیانِ کشمیر کی گردن ڈوگروں کی آہنی گرفت سے رہا کرا دی جائے۔ اور متحارب فوجوں کو ریاست کی حدود سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد ایسی غیر جانبدار حکومت قائم کی جائے۔ جو آزادانہ اور منصفانہ استصوابِ رائے کا انتظام کرے۔ تاکہ اہالیانِ کشمیر بلا خوف و خطر اپنی خواہشات کے مطابق یہ فیصلہ کریں۔ کہ وہ کشمیر کا الحاق پاکستان سے چاہتے ہیں یا ہندوستان سے۔ ایسی غیر جانبدار حکومت، ظاہر ہے نہ تو تنہا پاکستان کی ہو سکتی ہے، نہ تنہا ہندوستان کی، کیونکہ دونوں فریقِ مقدمہ ہیں۔ غیر طرفداری لازماً اقوامِ متحدہ کی ہونی چاہیئے۔ اس بین الاقوامی ادارہ کی متعین کردہ ہیئتِ منتظمہ ضرورت کے مطابق پاکستان اور ہندوستان سے مناسب طور پر استمداد کر سکتی ہے۔ کمیشن درحقیقت ایسے ہی تصفیہ پر مامور تھا۔ لیکن اس نے جو تجویز بطور اساس پیش کی۔ وہ افسوسناک ہے کہ اس میں واقعات کا بطلان ہے۔ یہ تجویز نہ پاکستان کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتی ہے، نہ آزاد کشمیر کی حکومت

استوار بن سکتی ہے

ہندوستان کشمیر میں کیوں لڑ رہا ہے؟ اور جب خود لڑ رہا ہے تو وہ پاکستان کو کیوں مبارز طلب اور حملہ آور کہہ رہا ہے؟ پاکستان کو وہ حملہ آور اس لئے قرار دے رہا ہے کہ کشمیر کو وہ ہندوستان کا حصہ سمجھتا ہے۔ اور کشمیر ہندوستان کا حصہ اس لئے ہے کہ ظالم و جابر مہاراجہ نے جنگ حریت کی بے پناہی سے عاجز آ کر ایک طے شدہ منصوبہ کے مطابق ہندوستان کے گورنر جنرل سے استمداد کی۔ اور ساتھ ہی الحاق نامہ پر بھی دستخط کر دیئے۔ محض اس آئینی اصطلاحی اقدام نے کشمیر کو ہندوستان کا حصہ اور جزو دار بنا دیا ہے۔ اور پاکستان کو حملہ آور۔ آئین و جمہوریت کا یوں تو تقاضا یہ ہے۔ کہ ریاستوں کا مستقبل جمہور کی آزاد خواہشات کے مطابق تشکیل پذیر ہو۔ لیکن اگر بالفرض مطلق العنان حکمرانوں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا جائے کہ صرف وہی اپنی ریاستوں کا مستقبل متعین کر سکتے ہیں۔ تو ہندوستان نے جوناگڑھ کے نواب کا فیصلہ الحاق پاکستان کیوں نہ تسلیم کر لیا؟ اس نے واضح فیصلہ کے باوجود جوناگڑھ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان نے جارحانہ اقدام میں خود پہل کی ہے۔ جوناگڑھ جو پاکستان سے ملحق ہو چکا تھا۔ لہٰذا پاکستان تھا۔ ہندوستان نے درحقیقت پاکستان پر حملہ کیا۔ دوسروں کی حدود مملکت کا احترام نہ کرنے والا آج احترام حدود کا سبق دے رہا ہے "فتنہ" کو ہوا دینے والا "فتن" کی ذمہ داری فریق ثانی پر ڈال رہا ہے۔ ظالم دوسرے کو ظالم کہہ کر اپنے ظلم کو چھپا رہا ہے۔ پاکستان نے اس موقع پر ضرورت سے زیادہ امن پسندی کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین اعلانیہ جنگ اسی وقت چھڑ گئی ہوتی۔ جوناگڑھ کے بعد حیدرآباد نے ہندوستان سے الحاق کرنا گوارا نہ کیا۔ اور آزاد رہنا پسند کیا۔ ہندوستان نے والئی حیدرآباد کا فیصلہ ٹھکرا دیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن جب اسی والی نے سپر اندازی کا فیصلہ کیا تو وہ تسلیم کر لیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان نے مختلف بلکہ متضاد انداز اور پیمانے کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ جو اقدام کشمیر میں جائز ہوتا ہے وہ جوناگڑھ اور حیدرآباد میں کیوں ناجائز ہو جاتا ہے؟

ہم اس وقت اس قضا و کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس تجزیہ کے لئے ذرا اس بین الاقوامی پس منظر کو پیش نظر رکھیے جو روس اور امریکہ کی مفاہمت کا شرمندہ تخلیق ہے اور جس سے بین الاقوامی سیاست مکدر بلکہ مسموم ہو چکی ہے۔ روس کی اب تک توجہ یورپ کی طرف تھی۔ یورپ یا مشرق اور مغرب روس اور امریکہ کے تصادم کا میدان بن چکا ہے۔ خوشحال یورپی ممالک مغربی اور مشرقی یورپوں کی حدبندیوں میں بٹ چکے ہیں۔ مشرقی علاقے روس کے زیر اثر ہیں۔ اور مغرب کی عنان قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک طرف اشتمالی انقلاب کے لپکتے ہوئے شعلے ہیں۔ اور دوسری طرف ڈالر کی طلائی زنجیریں۔ اقوام عالم کی نجات "یکجہتی" میں ہے یا "ایشیا" میں ہے؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ اب قومیں خانہ جنگی میں مبتلا ہیں۔ اور ہر خانہ جنگی بین الاقوامی جنگ کا پرتو ہے۔ یورپ میں اپنے قدم مضبوط کر کے اشتمالیت نے ایشیا کا رخ کیا ہے۔ چین برسوں سے شدید ترین خانہ جنگی میں مبتلا ہے۔ کوریا شمالی اور جنوبی بلکہ بالفاظ صحیح تر روسی اور امریکی حلقہ ہائے اثر میں بٹ چکا ہے۔ برما، ملایا، سیام، جزائر شرق الہند روسیت اور امریکیت کے میدان ہائے تصادم بن چکے ہیں۔ ایشیا جو اب تک محفوظ تھا عظیم و وسیع "برلن" بن چکا ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس اندرونی سیاست میں اس قدر الجھا رہا۔ کہ وہ بہت کم بین الاقوامی امور میں دخیل ہو سکا سنہ ۱۹۰۱ء میں اسے جاپان نے شکست دی۔ تو جاپان نے ایشیا کی قیادت کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ روس کے سیاسیات عالم سے غیر موثر ہونے سے پیشتر واقعی جاپان ہی امیدوار قیادت ہو سکتا تھا۔ گزشتہ جنگ میں شکست سے بیکار ہو کر

جاپان بہ حیثیت مفتوح گر بیٹھا ہے۔ وہ امریکہ کے چنگل سے کب نکل سکے گا۔ اور کب اپنے آپ میں ہو سکے گا؟ اس کے متعلق گزشتہ تین سال کی رفتار سیاست کوئی خوش آئند جواب مہیا نہیں کر سکتی۔ ایشیا کی قیادت کی مسند خالی دیکھ کر پنڈت نہرو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ نہرو انگریز کی نوازشات کے صدقے میں عارضی مرکزی حکومت پر متمکن ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہوس قیادت نے مجبور کیا۔ کہ وہ موتمر ایشیا طلب کریں۔ ہر چند سنہ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ موتمر کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ناکامی جذبۂ قیادت کے افسردہ کرنے کیلئے کافی نہیں تھی۔ اب پنڈت نہرو آزاد ہندوستان کا وزیر اعظم ہے۔ اب اس کے عزائم کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ روس کو چھوڑ کر ایشیا میں کوئی عظیم قوت موجود نہیں جبکہ ممالک ایشیا درماندہ ادھبے جا رہے ہیں۔ ان میں کوئی ملک قیادت سنبھالنے کے اہل نہیں۔ برصغیر ہند جغرافیائی حیثیت اور اہمیت کے پیش قیادت کے خواب بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ نہرو جیسا "بین الاقوامی" اس زریں موقع کو ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ اس قیادت پر حریص نگاہیں ڈالنے کیلئے نہرو کے پاس ایک اور وجہ بھی ہے۔ اندرون ہند اس کی قیادت مخدوش ہو گئی ہے۔ اس کا زبردست اور طاقتور حریف پٹیل ہے۔ نہرو کے پاس سب سے بڑی تائید اپنی حمایت میں گاندھی کی تھی۔ گاندھی کی موجودگی میں نہرو کی قیادت مسلم تھی۔ پٹیل گاندھی جیسی مہاتمائی شخصیت کے سامنے بے بس تھا۔ اس نے گاندھی کی شخصیت کے اثر کا دندان شکن جواب راشٹریہ سیوک سنگھ اور سکھوں کی صورت میں مہیا کیا۔ اس کے ہاتھ میں یہ دو خطرناک حربے ہیں۔ اس کے برعکس نہرو ہلکا ہے۔ پٹیل چاہے تو آج نہرو کو یک جنبش دو گوش حکومت بدر کر سکتا ہے۔ لیکن اسے نہرو کی ضرورت ہے۔ نہرو کو نکالنے سے ہڑ بونگ مچ جانے کا اندیشہ ہے۔ کیوں نہ نہرو کو حکومت میں شامل رکھا جائے۔ اور اسے الجھائے رکھا جائے۔ وہ کامیاب ہوا تو ہندوستان کامیاب ہو گا اور ناکام ہوا تو اسے بساط سیاست سے پٹے ہوئے مہرے کی طرح ہٹ جانا پڑے گا۔ پٹیل اور نہرو میں یہ تقسیم کار ہے

نہرو بین الاقوامی سیاست کا مہرہ بن رہا ہے۔ اور پٹیل اندرونی استحکام میں مصروف ہے۔ اب اندرون ہند تو پٹیل کی قیادت ناقابل تنقید اور خارج از بحث ہے۔ نہرو اپنی کمزوری کے پیش نظر [illegible] اور اپنے طبعی رجحانات کو بالائے طاق رکھ کر ہندو بن چکا ہے۔ اب وہ وسیع المشرب اشتراکی نہیں۔ اندرون ہند وہ پٹیل کا ہم مشرب ہندو برہمن ہے۔ اور بیرون ہند سیاست قوت کا علمبردار۔

نہرو مجبور ہے۔ کہ اپنی ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے بین الاقوامی میدان تلاش کرے۔ چنانچہ اس نے سنہ ۱۹۴۷ء میں موتمر ایشیا کا ڈھونگ رچایا جو اکارت گیا۔ وہ جاپان کے خلا کو پر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس کا اصل حریف میدان میں آ گیا ہے وہ حریف عالمگیر فرنگیوں یعنی ڈالر اور استحصال کے نقیبوں میں سے ایک یعنی روس ہے۔ ہندوستان روس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہرو کیلئے مشکل اندر مشکل ہے۔ ایک طرف پٹیل ہے ایک طرف سٹالین۔ پٹیل سے وہ تقسیم کار کر چکا ہے۔ سٹالین کے مقابلہ میں امریکہ بھی ہے۔ کیا وہ دو قوتوں کی جنگیں بڑھ جائے گا؟ نہرو اپنی ناقابل رشک پوزیشن کے باعث ایسے تضاد کو یقیناً نبھا لیگا۔ اس کے بچپن کے میلانات اشتراکیت اسے سٹالین کی گود میں لے جائیں گے اور موجودہ پٹیلی اثرات اسے سرمایہ دار امریکہ سے ناطہ جوڑنے میں مدد دینگے۔ ہندوستان وسیع و عریض ملک ہے۔ وہ اچھا خاصا صنعتی بھی ہے۔ اس میں ابھی صنعتی فروغ کے امکانات ہیں امریکہ اس منڈی پر ضرور قبضہ کرنا چاہے گا۔ امریکہ کی عالمگیر دفاعی منصوبہ بندی میں ہندوستان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بحر اوقیانوس بحر ہند اور بحر الکاہل کا مشترکہ فارغ ہے۔ برصغیر ہند و پاک کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ روسی یلغار اس طرف سے آئیگا۔ ایک کا نعرہ جیب ہے۔ تو دوسرے کا شکم۔ پر دونوں کا فلسفہ حیات "جیب و شکم" سے بڑھ کر نہیں۔ یہ ہے نہرو اور پٹیل کی متضاد مگر معاون سیاست کے

زیر اثر امریکیت و روسیت کا مقام اتصال ہوگا۔ ایک حد تک، ایک وقت تک قائدین ہند دونوں مخالف گروہوں سے ہی بھگت کرینگے۔ اور ترقی کرینگے۔ ہندوستان خطِ جنگ کے آخری نقطوں یعنی روس اور امریکہ کے مقامات سے بہت حد تک آگاہ معلوم ہوتا ہے۔ روس کو اس نے اتنی اہمیت دی ہے۔ کہ وزیراعظم نہرو کی بہن بنفسِ نفیس نمائندہ ہند بنکر وہاں گئی ہے۔ وجے لکشمی نے جنرل اسمبلی میں اپنا دامن بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اگر دنیا دو متحارب گروہوں (یعنی روس اور امریکہ) میں بٹ گئی۔ تو جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں ہندوستان امن بحال رکھنے کے لئے دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی حزب بندی نہیں کرے گا۔ امریکہ میں راما راؤ سفیر ہند مصروف عمل ہے۔ ۲۰ اکتوبر کو نیویارک میں کاروباری نمائندوں کو کہا گیا۔ اگر ہندوستان میں معیارِ زندگی بلند نہ ہوا۔ تو خطرہ ہے کہ ہندوستان کوئی اور نظریۂ حیات قبول نہ کرلے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اشتمالیت ہو یا نسلائیت یا کوئی اور ذہنیت "ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی قرار پر ایشیا کے امن کا دارومدار ہے۔ اور یہی عالمگیر امن کا ضامن ہے۔ ہندوستان نے روس کی طرف اشارہ کرکے کاروباری امریکہ کو بات سمجھا دی ہے۔

یہ بھگت کس کام آئیگی؟ ہم نے ابھی پٹیل اور نہرو کی رقابت کا ذکر کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا ہندو مزاج و ذہنیت کا جائزہ لیجئے۔ ہندو سود خوار بنیا اور تنگ نظر قوم ہے۔ اس کی معاشرہ میں درگذر اور رواداری نہیں۔ حیرت کا مقام ہے۔ کہ یہ متضاد بلکہ متخالف گروہ جو ہمیں آج ہندو قومیت کا حامی نظر آرہا ہے۔ ان میں کوئی مثبت قدر مشترک نہیں۔ ہندو قوم تاریخ عالم کا دلچسپ تجربہ ہے۔ یہ سرتاسر سلبی اساس پر استوار ہے۔ گاندھی کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے اپنے ایشوع سامنے رکھے۔ اور اساس قومیت کی منفیانہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہی۔ گاندھی متضاد و دلچسپ شخصیت تھی۔ اتنی بڑی شخصیت کی زندگی میں اس قدر تضاد پایا جانا ناقابل فہم نظر آتا ہے۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے۔ تو یہ تضاد آئینہ تھا۔ انہی منفی احساسات کا ہندوستان کے وہ غیر متجانس باشندے جو آج ہندو قوم کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یقیناً ایک قوم نہ تھے۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ نام نہاد ہندو حکمرانوں نے ایک دوسرے کے خلاف مسلمانوں کی امداد کی۔ لیکن جب مسلمان ان سب پر غالب آگئے تو مسلمان دشمنی ان عناصر کے لئے وجہ جامعیت ہوگئی۔ اس کا نقطۂ تکمیل گاندھی تھا۔ گاندھی نے منفی اساس کو اثباتی پہلو دینے کی کوشش کی۔ اور ہندوستان کو بحیثیت قدرِ مشترک پیش کیا۔ یعنی قومیت ہندو کی جو اب تک مسلمان دشمنی پر قائم تھی۔ اسے دوسرا سہارا وطنیت کی صورت میں دیا جانے لگا۔ اب ہندو قوم کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو کس حد تک مثبت بنیادوں پر استوار کرتی ہے۔ کوئی قوم بہت دیر تک سلبی اساس پر قائم نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا جب بھی کوئی مثبت خطرہ پیش آیا وہ مات کھا جائے گی۔ ہندو قوم ابھی ایسے خطرے سے دوچار نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی مسلمان دشمنی کو وجہ جامعیت بنائے ہوئے ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے۔ اس کے لئے مسلمان دشمنی اور وطنیت مترادف ہو جائیں گی۔ کیونکہ مسلمان فرقہ سے ایک قوم (اور ملک) بن گئے ہیں۔ اس طرح نفی سے اثبات تراوش کرے گا۔

کم و بیش پچیس سال پیشتر ہندوؤں کی مسلم دشمنی نے راشٹریہ سیوک سنگھ کی مرئی شکل اختیار کی۔ یہ ادارہ یکسر مسلم دشمنی کی بنیادوں پر استوار ہوا اور اس پر آج تک قائم ہے۔ اب بھی اس کا پیش نہاد استیصال مسلم ہے۔ سنگھ کو سنگھیوں سے کمک ملی۔ ہندو نے سکھ کو اپنی اغراض کا آلۂ کار کچھ اس انداز سے بنایا ہے۔ کہ سکھ مباحث

مرکزی نقطہ میں مسلم دشمنی ہی قرار پاگیا ہے۔ سکھ اور سکھ ہندوستان کی تخریب کے دو خطرناک عوامل ہیں۔

راشٹریہ سنگھ کا سرغنہ پٹیل ہے اور سکھوں کا مہاراجہ پٹیالہ۔ پٹیل اور پٹیالہ محور نے انتہائی مسلمان دشمنی پر اتحاد کیا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمان کے خون کا آخری قطرہ پی کر سکھ فارغ سے نظر آنے لگے۔ ادھر پٹیل کو اندرونی استحکام کے لئے ریاستوں کے تخریب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سکھ ریاستوں کا معاملہ نازک تھا۔ لیکن بتدریج پٹیل نے پٹیالہ کو ادغام کر ہی دیا۔ البتہ سکھوں سے اس نے امتیازی سلوک کیا۔ گاندھی کے قتل کے بعد فرقہ وار انجمنیں زیر عتاب آگئیں اور ان کی "فوجیں" بھی ختم کردی گئیں لیکن سکھوں کو از قبیل مستثنیات رکھا گیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں یعنی گاندھی کے قتل کے فوراً بعد تارا سنگھ نے ایک گورمکھی پمفلٹ میں کہا۔

"حکومت ہند فرقہ پرستوں کی تلاش میں ہے۔ میں فخر کہتا ہوں کہ میں فرقہ پرست ہوں۔ حکومت ہند کے مجھ پر ہاتھ ڈالے اور پھر نتائج دیکھے۔"

پٹیل کے لئے یہ ایک مصیبت تھی۔ اس کی راشٹریہ سنگھ گاندھی کے قتل سے منسوب ہو گئی تھی۔ وہ اعلانیہ اس کی حمایت نہیں کرسکتا تھا۔ سکھ قبضے سے باہر ہو گئے تو دوسری مصیبت ہو جائیگی۔ اس نے ایک طرف یہ کہہ کر کہ "سنگھ کو ڈنڈے کے زور سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ڈنڈا چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے ہے اور سنگھ نہ چور ہے نہ ڈاکو، بلکہ محب وطن" سیوک سنگھ کے حق میں فضا سازگار کی اور دوسری طرف سکھوں کی پاکستان دشمنی کا فائدہ اُٹھایا۔ فروری کے پمفلٹ میں تارا سنگھ نے یہ بھی کہا تھا:۔

مجھے اُمید ہے۔ کہ کانگریس بھی اس وقت تک مجبور نہیں کریگی جب تک کہ ہم پاکستان سے نپٹ نہیں لیتے۔ ورنہ جب پاکستان کا معاملہ حل ہو جائے گا۔ تو ہم اپنی توجہ کانگریس کی طرف پھیرینگے۔

"فرقہ واریت کے زہر کو ختم کرنے کے لئے ایک طرف تو یہاں تک تشدد برتا گیا کہ پاکستان ریڈیو سننے پر مسلمانوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اور دوسری طرف کھلا طرفداری و نوازش اسے بے جا کی یہ کیفیت تھی کہ جنرل موہن سنگھ کی فوج و راشٹریہ سیوک سینا کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ بعض یہی نہیں بلکہ مشرقی پنجاب کی حکومت نے اس سے یہ ساز باز کی کہ وہ تین اضلاع میں اس فوج کی باقاعدہ تنظیم و تربیت کرے۔ اسی موہن سنگھ کے متعلق بعد میں حکومت مشرقی پنجاب کو یہ کہنا پڑا۔

موہن سنگھ نے ایک سکیم تیار کر رکھی تھی کہ وہ فوج مرتب کرکے مناسب موقعہ پر صوبائی کاروبار حکومت پر قبضہ کرے۔ ۔ ۔ ۔ وہ سکھوں کو ہندوؤں کے خلاف اُبھارتا رہا ہے۔ اس نے نیشنل والنٹیر کور میں گیارہ ہزار کی بھرتی کر لی تھی۔

سکھوں نے تقسیم پنجاب کا مطالبہ یہ فرض کیا تھا کہ مشرقی پنجاب کے وہ بلا شرکت غیرے مالک بن جائیں گے۔ سکھ ریاستیں وہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ اور ان کی پوزیشن مستحکم بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حکومت ہند سے یہ سودا کرنا چاہا کہ وہ اس سرحدی علاقہ میں انہیں کھلا چھوڑ دے۔ جہاں تک پاکستان دشمنی کا تعلق ہے۔ ہندو اس کی آزادی تو سکھ کو دے سکتا ہے۔ لیکن آزادی دیکر سکھ خود اس کیلئے بھی مصیبت بن جائے گا۔ سکھوں میں کوئی مرکزی نقطۂ خیال نہیں۔ یہ ان کے فقدان تدبر کا باعث ہے اور اس کے ہاتھوں وہ انتہائی نقصان اُٹھاتے چلے آئے ہیں۔ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکال کر وہ یقیناً مطمئن و خوش نہیں۔ وہ کئی زبانوں سے بول رہے ہیں اور انہیں معلوم نہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ان کا مطالبہ غیر واضح ہے

انہیں خود اس کا یقین نہیں۔ ان میں تشخص کا احساس ضرور ہے۔ لیکن پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ اب ہندو ان کے اندھے پن کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ سکھ علیحدہ سکھ حکومت کے مطالبہ سے ہٹ کر پنجابی زبان کے صوبہ کے قیام تک آ گئے ہیں۔ تارا سنگھ اب بھی ان سے سودا کرتا ہے۔ حیدرآباد پر حملہ کے وقت وہ پھر بول اٹھا تھا کہ حیدرآباد سے فارغ ہو کر ہم پاکستان کی طرف توجہ دیں گے۔ وہ اپنی ہستی کا احساس دلا کر اپنی قدر و قیمت کا اندازہ دلانا چاہتا ہے اور کسی آڑے وقت کام آ کر وہ قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ بطور آلۂ کار استعمال ہونا چاہتا ہے۔ اس سے ہندوستان میں بھی سکھوں کا تشخص و مستقبل موہوم ہو گیا ہے۔ ہندو راج کے جذبات نفرت سے کھیلتا رہیگا اور ادھر ادھر راستے الجھاتا رہیگا اور بتدریج اپنے نگلتا جائے گا۔ تاآنکہ سکھ بحر ہند کی تہ میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملیگا۔ ہندو مت ایسے کئی گروہ چاٹ چکا ہے۔

سکھوں کی طرح ہندوؤں کی معاشرت اور سیاست میں بھی زبردست نفرت و حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس نفرت کی نمائندہ سیوک سنگھ ہے اور سیوک سنگھ کا سرغنہ پٹیل ہے۔ پٹیل دو کشتیوں میں سوار ہے۔ وہ ایک طرف بمبئی کے سرمایہ داروں کا سردار ہے اور دوسری طرف سیوک سنگھ ایسی فسطائی اور شاونسٹ CHAUVINIST جماعت کا رہبر۔ سیوک سنگھ نے جس بیدردی سے گاندھی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اس سے پٹیل ناقابل شکست قوت بن گیا ہے۔ نہرو کی پوزیشن اسی تناسب سے کمزور ہے۔ اب اندرون ہند اس نے عنان حکومت پٹیل کے سپرد کر دی ہے۔ یعنی حکومت کی اندرونی حکمت عملی پٹیل کی ہے۔ سیوک سنگھ نے جو قوت حاصل کر لی ہے اس سے وہ حکومت کی زبردست حریف بن گئی ہے۔

پٹیل اپنی پوزیشن کس قدر مستحکم کر چکا ہے؟ اس کا اندازہ اس کی یکم اکتوبر کی تقریر (نئی دہلی) سے ہوتا ہے

> اب اندرون ملک فسادات نہیں ہوں گے اب میں ہی پولیس کو سنبھالوں گا اور ملک کی اندرونی حالت کا خیال رکھوں گا۔

یہ کہنا کہ پٹیل اور نہرو میں اختلافات ہیں کسی ثبوت کے محتاج نہیں۔ گاندھی کے قتل پر ہر دو کے بیانات سے صاف پتہ چلتا تھا کہ دونو کے جذبات مختلف ہیں۔ ایک فاتح ہے دوسرا شکست خوردہ۔ پٹیل نے حال ہی میں ۱۰ اکتوبر کو اس اختلاف کا تذکرہ کیا ہے۔

> الزام لگایا جاتا ہے کہ پنڈت جی کابینہ میں کافی قوت نہیں رکھتے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ کابینہ میں دو پارٹیاں بن گئی ہیں۔ یہ تمام بیانات یکسر غلط ہیں۔ میں نے پنڈت نہرو کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا ہے۔ میں اس وقت کابینہ میں نہیں رہوں گا جب میرے تعلقات لیڈر کی سند قبول سے محروم ہو جائیں یا ان سے ان کے ہاتھ مضبوط نہیں ہوں گے۔

۱۰ اکتوبر کی نشری تقریر میں اس اختلاف کا بالواسطہ ذکر نہرو نے کیا:

> اگر ہندوستان نے جارحانہ اقدام شروع کر دیئے تو میں اور میرے بہت سے شرکائے کار کی حکومت ہند میں کوئی جگہ نہیں رہیگی۔

کیا نہرو کے ایسے شرکائے کار بھی ہیں۔ جو اس کے باوجود حکومت ہند میں باقی رہ جائیں گے؟ پٹیل اور نہرو کے دونو بیانات ملا کر پڑھئے اور اس نتیجہ کو محسوس کیجئے کہ ایسی صورت پیدا ہو گئی۔ اور نہرو کابینہ سے نکل گیا۔ تو باقی کون رہ جائیگا؟ اس نتیجہ کو کہ پٹیل اور نہرو نے علی الترتیب اندرون و بیرون

ملک کے میدان ہائے سیاست سنبھال لئے ہیں۔ نہ مزید تقویت یوں ملتی ہے کہ نہرو اور اس کے بیرونِ ہند نمائندے یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ حیدرآباد تو ہندوستان کا خانگی معاملہ تھا۔ لہٰذا یہ اقدام جارحانہ نہیں ورنہ ہندوستان تو کسی ملک پر حریص نگاہیں ڈالنا نہیں چاہتا۔ وجے لکشمی نے ۲۰ ستمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کہا

ہم نے بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ میں پورے

عجز و ندامت سے اعتراف کرتی ہوں۔

کہ ہم مہاتما گاندھی جیسے لیڈر کے ناخلف

ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن ہم نے کسی قوم پر

حملہ کرنے کی غلطی نہیں کی۔ ....

.... ہمارے ایسے کوئی مشئوم عزائم نہیں

ہندوستان میں نہرو نے پیرس میں وجے لکشمی اور مدالیار نے، لندن میں کرشنا مینن نے اور امریکہ میں راما راؤ نے ایسے ہی انداز کا پروپیگنڈا کیا اور ہر ایک نے نہرو کے الفاظ میں اقوام متحدہ کی خامیوں کے باوصف اس پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ اور اسی کے اصولوں سے متمسک و وابستہ رہنے کا اعلان کیا۔ ان تقریروں میں خطاب بیرونِ ہند سامعین اور قارئین سے تھا۔ اس لئے ہندوستان نے اپنی معصومیت و بے گناہی کا مبالغہ آمیز پرچار کیا۔ اس کے برعکس اندرونِ ملک پٹیل اپنی ڈفلی الگ بجا رہا ہے۔ اس نے حفاظتی کونسل Security Council پر یعنی حفاظتی کونسل Security Council کی پھبتی کسی اور کہا کہ اگر ہم پر اس کونسل کی پابندی نہ ہو۔ تو حیدرآباد کی طرح کشمیر کا مسئلہ آنِ واحد میں حل کر لیں۔ نیز حیدرآباد کی بدامنی کو دور کرنے کے تابع مذمت رویّہ کے جواز میں پٹیل یہاں تک حد سے تجاوز کر گیا کہ برما کی تعمیر کو اس نے کہا۔

ہندوستان کو ہمسایہ ممالک کے خلفشار

کے اثرات کے خلاف بھی تحفظات کرتے

ہیں۔ برما میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے اور

حکومت کی فوجیں باغیوں کے خلاف

لڑ رہی ہیں۔ برما اور ہندوستان کی سرحدات

مشترک ہیں۔

بالکل ایسے ہی مشترک ہیں جیسے ہندوستان اور حیدرآباد کی تھیں اور ہندوستان اور پاکستان کی ہیں۔ کسی ملک پر حملہ کرنے کے لئے کتنا آسان اور معصوم بہانہ ہے!

برما بھی تو کبھی ہندوستان ہی کا حصہ تھا!!

ہندوستان کے ان متضاد و متخالف عناصر کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ نامحالہ ٹکرائیں گے۔ ان میں توازن بدیں صورت پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ انہیں مشترک دشمن کے خلاف متحد رکھا جائے۔ مشترک دشمن مسلمان موجود ہے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ صید زبوں ہے۔ اندرونِ ہند مسلمان ہندو اور سکھوں کے رحم و کرم پر ہے اور جب تک وہ موجود ہے۔ ہندو اور سکھ متحد رہیں گے۔ اب اتفاق سے مسلمانوں نے پاکستان کی صورت میں اپنی الگ حکومت بھی بنالی ہے۔ صدیوں سے جو نفرت ہندوؤں اور سکھوں کے قلوب میں جاگزین کی جاتی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے۔ کہ وہ پاکستان کی موجودگی کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ پاکستان کا قیام بھارت ماتا

سلہ اور ابوالکلام آزاد دلی کی جامع مسجد میں تبلہ رو ہو کر حلف اٹھا رہا ہے۔ کہ ہندوؤں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے انہیں خدایانِ لندن کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ "بادشاہ سے بھی بڑھ کر وفادار MORE LOYAL THAN THE KING" اسی کو کہتے ہیں۔

کی تقسیم ہے اور ہندو پنڈار کی شکست۔ ہندو اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو ایک قوم بنایا۔ اور کیا اب مسلمان بھی ہندوؤں کی قومیت کی منفی اساس کو اثباتی حیثیت دینگے؟ مسلمان کی مخالفت پاکستان کی مخالفت ہے اور پاکستان کی مخالفت وجہ تخلیق جذبہ وطنیت ہندو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی دشمنی ہندوؤں اور سکھوں میں مشترک جذبات وطنیت پیدا کر دے اور سکھ اپنی قومی تشخص فراموش پاکستان کر دیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ پاکستان کی موجودگی ہندو سکھ قوت کو حملہ کی دعوت ہے۔ اور ان کے لئے وجہ استحکام و قوت ہے۔ یہ صحیح ضرور ہے لیکن اس کے برعکس یہ بھی صحیح ہے۔ کہ پاکستان اس اتحاد ناپاک کا قاتل بھی بن سکتا ہے۔ پاکستان ان کی منفی اساس کو اثبات میں بھی بدل سکتا ہے۔ اور پاکستان اس منفی اساس کو کالعدم کر کے اس محور کو بے بنیاد بھی کر سکتا ہے۔ ہندوستانی حکومت مجبور ہے۔ کہ وہ ان مار ہائے آستین کو مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف استعمال کرے، اس کی ہنگامی سلامتی اسی میں ہے۔ لیکن اسی میں اس کی ہلاکت بھی ہے جو ناگڑھ پر جس دیدہ دلیری سے اخلاق و آئین کے ضابطوں کو ٹھکراتے ہوئے ہندوستان نے حملہ کیا اور اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ وہ اس کی اندرونی بدامنی اور خلفشاری کا ثبوت ہے۔ جونا گڑھ نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے۔ حملہ کشمیر کی علت بھی یہی ہے۔ لیکن کشمیر پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوا۔ ہندوستان اس خارزار میں الجھ گیا ہے۔ کشمیر نے ہندوستان کے حوصلے پست کر دیئے۔ مگر حیدر آباد ان کے لئے آب حیات ثابت ہوا حیدر آباد کا المیہ سناک بلکہ شرمناک سقوط مسلمانوں کے لئے مایوس کن بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ ذرا سنجیدگی سے دیکھا جائے۔ تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے،

کہ حیدر آباد کا سقوط، حیدر آباد کی فوجی شکست ہے اور نہ ہندوستان کی فوجی فتح۔ ہندوستان نے جو تین سو ٹینک حیدر آباد کی نام نہاد جنگ میں جھونکے وہ محض بطور نمائش تھے۔ ان ٹینکوں نے کوئی معرکہ سر نہیں کیا۔ حیدر آباد کا سقوط نتیجہ ہے ہندوستان اور نظام کی کمینہ سازش کا۔ نظام نے تاریخ کو دہراتے ہوئے ایکبار پھر ملک و ملت سے غداری کی اور جعفر دکنی کا ابلیسی لبادہ اوڑھا۔ اس سازش کا تار و پود بہت پہلے تیار ہو چکا تھا۔ ہندوستان اپنی فتح کا کتنا ہی ڈھنڈورہ کیوں نہ پیٹے حقیقت بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ کہ حیدر آباد سازش کا شکار ہوا ہے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی بمبئی میں نہرو نے کہا تھا۔ کہ حیدر آباد کی لڑائی بہت جلد ختم ہو جائیگی۔ یہ پیشین گوئی نہ اپنی قوت کے زعم میں تھی نہ حیدر آباد کی مزعومہ ناطاقتی کے باعث، بلکہ اس اعتماد پر مبنی تھی۔ جو نہرو کو اپنی پس پردہ سازش پر تھا۔ رضا کار اور نظام کی سابق کا بنیہ اس حیثیت سے البتہ ہندوستان سے ضرور مات کھا گئے۔ کہ وہ اس سازش کو نہ بھانپ سکے۔ وہ آزادی خواہی اور زور بازو پر بھروسہ کرتے رہے اور ہندوستان غدار نظام سے ملکر انہیں دھوکہ دے گیا۔ مسلمانوں کو یہ امر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے حیدر آباد ہندوستانی سازش اور نظام کی غداری کا شکار ہوا ہے۔ اس کا سقوط ہندوستان کی فوجی قوت کا ہرگز ثبوت نہیں۔

دروغ گو را حافظہ نباشد کے مصداق ہندوستانی اس باب میں بھی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ہندوستان کے نیم سرکاری اخبار "ہندوستان ٹائمز" نے ۲۲ ستمبر کی اشاعت میں تحریر کیا ہے

ہمیں توقع ہے کہ اقوام متحدہ کے ہندوستانی نمائندے اس حقیقت کو خاص طور پر

نمایاں اور نشر کرینگے کہ نظام کی افواج نے مطلقاً کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ نظام کی افواج صرف ایک ہی موقعہ پر ہندوستانی افواج کے روبرو آئی ہیں۔ اور وہ موقعہ وہ تھا۔ جبکہ انہوں نے ہتھیار ڈالے ہیں۔

نہرو اور پٹیل اس حقیقت کا اعتراف نہیں بلکہ انکار کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو صورت پیدا ہو گئی ہے اس کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ حیدرآباد کی آزادی کی لاش پر کھڑے ہو کر نہرو کہتا ہے:۔

ہم مذہبی اور قانونی نقطۂ نگاہ سے پاکستان پر حملہ کرنے میں حق بجانب ہوتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم مہاتما گاندھی کی تعلیم میں تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دینا چاہتے۔۔۔ ہم نے اگر پاکستان پر حملہ کیا۔ تو ہم کشمیر کے پہاڑی علاقوں کے ذریعہ نہیں آئیں گے۔ بلکہ باب پنجاب سے حملہ کرینگے۔۔۔ ہمارا حملہ نہ کرنا کمزوری کی وجہ سے نہیں۔ آپ نے ہماری قوت تو دیکھ لی ہے (ابھر جنگ ختم اور ہمارا اکتوبر کی تقریر یا) ہندوستان کی فوجی طاقت حیدرآباد میں بھی دیکھ لی گئی ہے۔ اور کشمیر میں بھی۔ لیکن یہ نہرو کا اقبال تھا یا تکبر Boast؟

ہم پھر دہراتے ہیں۔ کہ حیدرآباد ہندوستان کی فوجی فتح نہیں۔ نیز اس کو بھی نہ بھولئے کہ ہندوستان روبرو آنے کے بجائے سازش کا معتقد ہو چکا ہے۔ گزشتہ دو تین سال میں خصوصیت سے اس نے جو کچھ حاصل کیا نہ استدلال سے حاصل کیا نہ انصاف سے بلکہ ہمیشہ سازش سے یہ سیاسی بلیک مارکیٹ اس کیلئے ابتک فائدہ مند سودا ثابت ہو رہی ہے۔ ہمارا واسطہ سیاسی سوداگروں بلکہ قمار بازوں سے ہے۔ جو قوموں کی بازی کھیلتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستانی میدانِ جنگ میں ڈٹ کر اور جم کر لڑنے کیلئے زیادہ حوصلہ نہیں رکھتے۔ ان میں اتنی استقامت نہیں ہے۔ مشرقی پنجاب کا قتلِ عام یکطرفہ تھا۔ مسلمان نہتے اور بدحواس تھے اور سکھ مسلح بھی تھے اور ہندوستانی فوج کی پناہ میں بھی تھے۔ اس کے باوجود جہاں کہیں بھی دو چار مسلمان جمع ہو کر مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ کشمیر میں اس کا وافر ثبوت ملتا ہے۔ ہندوستانی فوج جدید آلات حرب سے مسلح ہے اس کے پاس بھاری کلدار سامانِ جنگ ہے۔ مگر مقابلتاً کم مسلح مجاہدین کو ہرا نہیں سکی۔ اتنا غیر متوازی مقابلہ ہندوستان کے لئے شرمناک ہے۔ فوجی ماہرین کے لئے یہ شواہد زندہ شہادتیں ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ہندوستان جنگ جوئی اور مبارزت طلبی کی باتیں اس لئے نہیں کر رہا ہے کہ وہ عسکری اعتبار سے عظیم طاقت ہے۔ بلکہ ایک تو وہ اندرونی عوامل سے ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس آتشیں لاوے کا رخ پاکستان کی طرف نہ موڑے تو خود اس سیلاب آتش کی نذر ہو جائے۔ دوسرے وہ پاکستان سے متعلق غلط فہمی میں بھی مبتلا ہے۔ ہندوستان نے جب بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اور اس کے جو عظیم الشان نتائج نکلے وہ پاکستان کو معطل کرنے کے لئے کافی تھے۔ یہ احسانِ الٰہی تھا۔ اور ہمارے قائدِ اعظم کی غیر معمولی ہمت کہ پاکستان نہ صرف قائم رہا بلکہ مستحکم تر ہو گیا ہندوستان اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پاکستان ابھی جاں گسل زخم سے جانبر نہیں ہو سکتا۔ نیز وہ فوجی ساز و سامان جو پاکستان کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ بھی نے بہت دیر تک روک رکھا ہے۔ تو ہندوستان کی غلط فہمی

یہ ہے کہ ایک طرف پاکستان زخموں سے نڈھال ہو، دوسری طرف وہ عین سلح ہے اور جنگ کے ناقابل پاکستان کی امن پسندی کو اسی پر محمول کر رہا ہے۔ تیسری غلط فہمی اسے قائداعظم کی وفات سے ہے۔ ہندو ایک عرصہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا، ہاکہ مطالبۂ پاکستان قائداعظم کے دماغ کی اپج سے زیادہ کچھ نہیں۔ پاکستان ہاتھ سے رہے کر بھی اسکی آنکھیں نہیں کھلیں۔ اب قائداعظم کے رخصت ہو جانے سے اس کی امیدیں پھر بیدار ہو گئی ہیں۔ وہ خیال کرتا ہے۔ کہ مسلمان کو ذرا ڈرایا دھمکایا گیا تو پاکستان کا سقوط یقینی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کس حد تک پاکستان سے جنگ لڑنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ چند در چند غلط فہمیوں میں مبتلا ہے۔ وہ دھمکیوں سے کام لیگا۔ تخویف و ترہیب سمجھے گا۔ ففتھ کالم کو استعمال کرے گا۔ سابق نیشنلسٹ مسلم "فوج" بہ دستور تیار ہے۔ ہندوستان اسے پہلو بہ پہلو بدل کر آگے بڑھا رہا ہے۔ پاکستان کو ہمت اور دلیری سے کام لینا چاہیئے، اور دفاع وقت کو جملہ امور پر ترجیح اور فوقیت دینی چاہیئے۔

آزاد پاکستان ہندوستان کی ہوس قیادت ایشیا کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ ایشیا میں سب سے بڑی مسلمان آبادی کا ہے، وہ جو پاکستان کی قیادت تو قبول کر سکتا ہے، لیکن ہندوستان کی نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہندوستان پاکستان کا کانٹا پہلو سے نکالنا چاہتا ہے۔ اس کی غلط فہمی رفع ہونے اور مزاج بحال ہونے کی واحد صورت ایک فیصلہ کن معرکہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وادی کشمیر میں یہ معرکہ برپا کیا جا سکتا ہے، اور ہندوستان کی غلط فہمیاں ہمیشہ کیلئے دور کی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان کے دانت ایکدفعہ کھٹے کر دیئے گئے، تو وہ کبھی ہمارے منہ نہیں آسکے گا۔ اب وقت ہے، کہ اسے روکا جائے۔

یہ فیصلہ جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں۔ عاجلانہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری حکمت عملی مستقبل بعید کے تقاضا کے مطابق ہوگی۔ اور وہ تقاضا یہی ہے ـــ قوت، قوت، قوت!!! آبادی، رقبہ اور تنوع کے لحاظ سے پاکستان میں دولت عظمیٰ بننے کے سب امکانات ہیں۔ عالمگیر اسلامیہ کی امامت کے امکانات اس پر مستزاد ہیں۔ لیکن یہ حیثیت ایکدن میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے محنت، استقلال اور استقامت درکار ہے۔ ہمیں اپنے مقصد اصلی کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے، اور ہر قدم اسی سمت میں اٹھانا چاہیئے۔

لیکن جیسے ہندوستان چند غلط فہمیوں میں مبتلا ہے اسی طرح پاکستان کی بھی غلط فہمیاں ہیں۔ ہم نے اس حقیقت کی طرف سابقہ اشاعت میں بھی ضمناً اشارہ کیا تھا، لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اب ہم اسے واضح تر الفاظ میں دہراتے ہیں۔ مسلمان اس خوش فہمی میں ہے۔ کہ اس کے پاس ایمان کی دولت اور قوت ہے اور کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایمان واقعی بڑی طاقت ہے، اور کوئی دنیاوی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن وہی ایمان جو عمل یعنی جہاد کو مستلزم ہے۔ ایمان بغیر عمل کا جو تصور ہم لئے پھرتے ہیں، وہ ایمان نہیں جو فتح و ظفر کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ ایمان مشرقی پنجاب کے ایک ایک مسلمان گھرانے میں رسوا ہو چکا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ پھر بھی اسی نقلی ایمان پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ حیدرآباد میں رضاکاروں کا یہی ایمان رجال قوت، ہندوستانی ٹینکوں کی یلغار کو روکنے سے قاصر رہ چکا ہے۔ قرآن نے جو معیار رکھا ہے۔ وہ یہ ہے، کہ دس مومن ہوں تو وہ بیس کفار پر غالب آئیں گے۔ قرآن کے مومن اصحاب ایمان و عمل ہوتے ہیں۔ عمل ایمان کی ناگزیر شرط ہے۔ ہم دہراتے ہیں، کہ ایمان واقعی ہمارا امتیاز ہے، لیکن مادی جنگ بہر کیف مادی اسلحہ سے لڑی جاتی ہے۔ ایمان کی قوت اسلحہ کی کسی حد تک کمی کو پورا کر دیتی ہیں...

لیکن اسکا بدل نہیں ہوسکتیں۔ اگر خالی ایمان ہی دشمنوں کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتا تو قرآن میں گھوڑوں کے رسالے اور دیگر فوجی قوتوں کی تیاری کا حکم نہ دیا جاتا۔ نہ ہی رسول اللہ شمشیر بدست میدان جنگ میں تشریف لے جاتے۔ اس لئے ہمیں جذباتی نعروں کے فریب میں نہیں رہنا چاہئیے۔ اگر ہم تیار بھی ہوں گے اور صاحب ایمان بھی تو ہمیں یقیناً اللہ کی نصرت حاصل ہوگی۔ تو میں عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ تو وہ اس قسم کے تصوراتی سہارے ڈھونڈتی ہیں۔ ہندوستان از دوش تا کمر زرہ میں ڈوب رہا ہے۔ اور ہم "ایمان" کی بحثوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔

مادی تیاری کے ساتھ ساتھ ہمیں ۳ر جون ۱۹۴۷ء کے بعد کی سیاست کو خصوصیت سے نگاہ میں رکھنا چاہئیے یہ مسلمہ ہے کہ ہم نے عظیم الشان ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جب تک جنگ اُصولوں تک محدود رہی۔ ہم کامیاب رہے۔ لیکن جب عمل کا وقت آیا ہمارے قدم اُکھڑ گئے۔ وہی مسلم لیگ جو سیاسیات ہند میں قرآن مبین کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ جب نے ہندو اور انگریز سے پاکستان منوا کے چھوڑا۔ وہ ظالمانہ تقسیم کو نہ روک سکی۔ اور بے بس ہو کر رہ گئی۔ صوبائی تقسیم میں جو کمینہ سازش ہندو اور انگریز نے کی ہم اس سے بھی مات کھا گئے۔ ہندو لیڈروں نے بہت بھیانک نتائج: اقلیات کو بچانا اور کشمیر کو محفوظ و مسلح کرنا شروع کر دیا۔ ریڈ کلف نے ان کیلئے راستہ بھی بنا دیا۔ اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ کشمیر کا مقدمہ اقوامِ متحدہ میں پیش ہوا۔ تو ہم نے منطق و معقولیت کے زور پر دنیا کو اپنی حقانیت کا قائل کرا لیا۔ لیکن جب فیصلہ کرنے کا وقت آیا۔ تو ہندوستان پاکستان پر بازی لے گیا۔ عین آخری وقت میں پانسہ پلٹ گیا۔ حیدرآباد میں ہم حقیقتِ حال سے بے خبر رہے۔ ہم اس کی نمائشی تیاریوں پر مطمئن رہے اور ہندو بس پردہ نظام کو شریکِ سازش بنا کر حیدرآباد کو ہتھیا کر لے گئے۔ ہندوستان نے جونا گڑھ میں والئی ریاست کا فیصلہ ٹھکرا دیا۔ اور بزور شمشیر اسے فتح کر لیا۔ کشمیر میں اس نے والئی ریاست کا فیصلہ قبول کیا اور جنگ کی طرح ڈال دی۔ حیدرآباد میں اس نے الحاق کے خلاف والئی ریاست کا فیصلہ قبول نہ کیا۔ لیکن اس والئی ریاست کا سپر اندازی کا فیصلہ اس نے تسلیم کر لیا۔ اس تضاد اور آبرو باختگی کے باوجود وہ اقوامِ عالم کی صف میں دندنا رہا ہے۔ قلات میں ہندوستان نے سازش کی۔ فقیر ایپی کو اس نے اُبھارا۔ افغانستان پر اس نے ڈورے ڈالے۔ غرض وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہا۔ اور ہم ہیں کہ واقعہ گذر جانے کے بعد ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کیا ہماری اطلاعات اس قدر ناقص ہیں؟ کیا ہم دشمن کے لئے کوئی اُلجھن پیدا نہیں کر سکتے؟ کیا ہماری حیثیت اسی طرح دفاعی رہیگی؟ یہ سوالات گہرے غور و فکر کے محتاج ہیں۔ ہمیں عام افواہوں پر کان دھرنے اور انہیں نشر کرنے کے بجائے ان مسائل مہم کو سوچنا چاہئیے۔ اور مستقبل سے متعلق تدابیر سوچنی چاہئیے۔ متانت اور سنجیدگی سے۔ غور اور تدبر سے۔ محض جذباتی جوش و خروش سے نہیں۔ جذباتی نعروں نے ہمیں آج تک کوئی ٹھوس کام نہیں کرنے دیا۔ لیکن اب یہ سطحیت ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اب ہم آزادی حاصل کر چکے ہیں۔ یاد رکھئیے پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ اور قائم رہیگا۔ لیکن اس کے قیام کا دارومدار ہماری قوت بیوت اور عزم راسخ پر ہے:

بقیہ "لمعات" صفحہ ۱۶ سے آگے

ان کی شخصیت پچھلے دس بارہ سال سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز دمحور بنی ہوئی تھی۔ ساری قوم ان پر مجتمع تھی۔ ان کی راہ نمائی پر سب کو بھروسہ تھا۔ ان ہی کے ذاتی اثر و رسوخ نے تمام مختلف عناصر کو جوڑ کر مسلمانوں کو ایک متحدہ قوم بنایا تھا۔ ان ہی کے اعتماد پر قوم نے اپنی پوری طاقت اس جد و جہد میں لگا دی تھی جس کے نتیجہ میں آخر کار پاکستان قائم ہوا اور قیام پاکستان کے بعد اس نئی مملکت کی عمارت جس مضبوط ستون کے سہارے پر تعمیر ہو رہی تھی وہ بھی ان ہی کی جامع اور معتمد علیہ شخصیت تھی۔۔۔۔ صرف ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی پاکستان کی جو ساکھ اور دھاک تھی وہ زیادہ تر اسی آزمودہ کار مدبر کی بدولت تھی۔ کوئی دوسری شخصیت ہمارے ہاں ایسی نہیں کہ اس کے وقار اور تدبر کو بین الاقوامی برادری میں اسی درجہ بھروسے اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ دنیا کے لئے تو مرحوم کی وفات محض ایک بڑے اور مشہور رہنما کی رحلت ہے۔ مگر ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑی قومی مصیبت ہے۔ کیونکہ اس سے ہماری نوخیز مملکت کی طاقت اور ہماری قومی زندگی کو ایسا صدمہ پہنچا ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے اور ہماری مدد کرے۔

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۸ء)

پہلے ان خیالات کو دیکھئے جن میں اسی قائدؒ اور اس کے رفقائے کار کو منافقین کے گروہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان خیالات کو جن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ تمام تباہیاں اور بربادیاں اسی قائد کی غلط قیادت کا نتیجہ ہیں۔ اور پھر مسلمانوں سے پوچھا گیا ہے کہ کہو! ایسے قائد کی قیادت، بھروسہ اور اعتماد کے قابل ہے؟ اور پھر اسی قائد کے متعلق ان خیالات کو دیکھئے جن کا اظہار معاملہ کی قانونی نزاکت کے احساس کے بعد مندرجہ بالا الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ان سب کا موازنہ کیجئے اور پھر اندازہ لگائیے اس شخص کی سیرت کا، جو پیغمبرانہ انداز میں منافقین (مسلمانوں) کو از سر نو مسلمان بنانے کا مدعی ہے

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ان جذبات کو اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں جو اس کے پڑھنے سے ان نوجوانوں کے دلوں میں موجزن ہوں گے جو اس تحریک کو اپنے خلوص اور دیانت کی بناء پر فی الواقعہ روح اسلامی کا پیکر سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کا غم و غصہ اپنی جگہ بجا ہے اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے خلوص اور قوت فیصلہ پر حرف آتا

ایران کی عقیدت کو ٹھیس لگی ہے۔ لیکن یہ غم و غصہ ویسا ہی ہے جیسا ان لوگوں کے دلوں میں، جو نہایت خلوص اور نیک نیتی سے تحریک مرزائیت کو سچا سمجھ کر اس میں داخل ہو چکے ہوں، اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب کوئی اس تحریک کو بے نقاب کر کے ان کے سامنے پیش کرے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی تحریک نظریہ، عقیدہ، یا اصول محض اس لئے مبنی بر صداقت نہیں ہو سکتا کہ اس کے اختیار کرنے والوں نے اسے نہایت خلوص اور دیانت سے اختیار کیا ہے۔ اس طرح تو دنیا میں کوئی تحریک، کوئی نظریہ، کوئی عقیدہ اور کوئی اصول بھی غلط اور باطل قرار نہیں دیا جا سکے گا۔ جو کچھ ہم نے لکھا ہے کوشش کیجئے کہ آپ اسے ٹھنڈے دل سے پڑھ سکیں اس کے بعد سوچئے کہ کونسی راہ درست ہے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کی رائے وہی ہو جو اس سے پہلے تھی تو بڑے شوق سے اپنی رائے پر قائم رہیئے۔

فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ (۶/۱۰۵)

یاد رکھئے۔ ہم سب مسلمان اجتماعی طور پر ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ سب ایک ہی ماحول کے پروردہ اور ایک جیسی ہی مجبوریوں میں ماخوذ۔ ہم میں سے کسی کی بھی یہ پوزیشن نہیں جو دوسروں سے کہے کہ میں مسلمان ہوں اور تم منافق ہو۔ یہ حق صرف رسول کو پہنچتا ہے جو اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہوتا اور اس لئے درحقیقت ان میں سے نہیں ہوتا جن میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا اس مقام کا مدعی ہے تو وہ (خواہ مرزا صاحب کی طرح) زبان سے اس کا اعلان کر دے یا (مودودی صاحب کی طرح) لفظاً اس کا دعوے نہ کرے لیکن عملاً اپنے آپ کو اس مقام پر سمجھے، تو یہ پیغمبرانہ شان کا ادعا ہے۔ ہمارا صحیح مقام یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ ہم سب مسلمان ایک ہی مصیبت میں گرفتار اور ایک ہی ماحول کے مقید ہیں۔ آؤ۔ ہم سب مل جل کر کوشش کریں کہ اس غلط ماحول کو بدل کر اس کی جگہ صحیح اسلامی فضا پیدا کریں۔ اس باب میں ہم میں سے جو لوگ صاحب فکر و نظر ہوں گے ان کا کام اس قسم کی تجاویز سوچنا ہوگا جو ہمیں اس تبدیلی احوال پر قادر کر دیں۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز ہوگا۔ یہ ہے صحیح راہ عمل۔ نہ یہ کہ اپنے متبعین کو "اسلامی جماعت" کے افراد اور باقی مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن تصور کر لیں۔ اور ان سب کو ذلت کی نگاہ سے دیکھیں۔ یہ نفس کا دھوکا ہے۔ یہ مذہب اور حق پرستی کی آڑ میں ابلہ فریبی ہے۔ یہ وہ مسلک ہے جس کے متعلق خود ترجمان القرآن نے لکھا تھا

> منافقین کا ایک طبقہ وہ تھا جو مسلمانوں کی جماعت میں محض تفریق اور فتنہ و فساد برپا کرنے کی خاطر اسلام کا لیبل لگائے رہتا تھا۔ یوں تو جماعتی زندگی کیلئے تفرقہ عموماً مضرت رساں ہوتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ جو تفرقہ مذہب اور حق پرستی کی آڑ میں نمودار ہوتا ہے وہ ایسا زہر ہلاہل ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔

یہ تو غنیمت سمجھئے کہ اس جماعت کو کوئی طاقت حاصل نہیں ہوئی اور جمہور مسلمان اس کے پیچھے نہیں ہو لئے۔ ورنہ سوچئے کہ اُس وقت مسلمان، پاکستان کی مخالفت میں ان کے ہم نوا ہو جاتے تو اس کا نتیجہ پوری کی پوری قوم کی ہلاکت کے سوا اور کیا ہوتا۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ اس وقت جو کچھ ہندو اور انگریز کرتا ہے کرنے دو۔ تم بے فکر ہو کر اپنے اخلاق سنوارنے میں لگے رہو۔ جب تم اس طرح اصلاح یافتہ ہو جاؤ گے تو دنیا کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں آجائیں گی۔ اگر مسلمان ان کی مان لیتا اور بساط سیاست کو ہندو اور انگریز کے سپرد کر دیتا یا نیشنلسٹ قسم کے مسلمانوں کے حوالے تو اس وقت پورے کے پورے دس کروڑ مسلمانوں کی وہی حالت ہوتی جو ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی ہو رہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس لئے کہ پاکستان کی تشکیل کے بعد ہم پھر بھی اس قابل ہیں کہ اپنی آواز دنیا تک پہنچا سکیں اور اس دوران میں اپنی دفاعی قوتوں کو مضبوط کر کے مستقبل میں اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کا سامان بھی مہیا کر سکیں۔ لیکن اگر اس "اسلامی جماعت" کے مواعظ حسنہ کے تصدیق ہم مقدمۂ پاکستان سے خود ہی دست بردار ہو جاتے تو آج ہند و سیاست کا کابوس اس طرح ہمارا گلا دبائے ہوتا کہ ہماری آواز تک نہ نکل سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حیدر آباد کے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، حالانکہ وہاں حکومت ان کی اپنی تھی۔ ہم بھی غیر تقسیم شدہ ہندوستان میں قریباً اتنے ہی فیصدی ہوتے جتنے حیدر آباد کے مسلمان وہاں کے ہندوؤں کے مقابلہ میں تھے۔ یہ تو محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے محترم قائد اعظم (مرحوم) کی آواز میں ایسا اثر پیدا کر دیا کہ ان کے سامنے کسی دوسرے کا چراغ جلنے ہی نہیں پایا اور وہ اس طرح بساط سیاست پر اتنا بڑا مقدمہ جیت گئے۔ ورنہ مسلمانوں کی ہلاکت اور بربادی کے لئے کچھ کم سامان بہم نہیں پہنچائے جا رہے تھے۔ مسلمان کے خمیر میں مذہب پرستی ہے اس لئے ہماری سیاسی تگ و تاز میں قومیت پرست علماء کا گروہ ایک فتنۂ عظیم کا موجب تھا۔ ان کی زبانوں پر دن رات قال اللہ و قال الرسول تھا یہ وہ قال ہے جس پر مسلمان اپنا سب حال فدا کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ سے مسلمان خدا خدا کر کے بچا۔ اس لئے بھی کہ ہندو اور مسلمان کو ایک قوم سمجھنے کا جو تصور وہ حضرات پیش کرتے تھے وہ خود مسلمان کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس لئے مسلمان کے اس غیر شعوری جذبہ کے مقابلہ میں ان کا قال اللہ اور قال الرسول بھی ناکام رہا۔ لیکن مودودی صاحب پاکستان کی مخالفت میں اس کمزور پہلو کی مدافعت کا سامان بہم پہنچا کر باہر آئے تھے۔ انہوں نے متحدہ قومیت کی پہلے ہی مخالفت کرنی شروع کر دی تھی (حالانکہ اس سے پہلے یہ جمعیت العلماء کے اخبار۔ الجمعیت کے حلقہ ادارت میں تھے) اس لئے جو اعتراضات نیشنلسٹ علماء پر وارد ہوتے تھے وہ ان کی زد سے باہر ہو چکے تھے۔ لہٰذا جس انداز سے انہوں نے مسلمانوں کو اپنی طرف بلانا شروع کیا، وہ نیشنلسٹ علماء کے طریق و اسلوب سے بھی زیادہ جاذب،

معصوم اور نگاہ فریب تھا اور بہت کم لوگ تھے جو یہ بھانپ سکے کہ اس دعوت سے مقصود بھی مسلمانوں کو متحدہ پاکستان سے الگ رکھنے کی کوشش ہے۔ جمعیت العلماء کے افراد چونکہ کھلے بندوں نیشنلسٹ بن کر سامنے آئے تھے اس لئے تشکیل پاکستان کے بعد ان کا مسلمانوں میں گھل مل جانا مشکل تھا۔ لیکن اسلامی جماعت کے افراد (مرزائی حضرات کی طرح) یکسر پاکستانی بن گئے۔ اس سے کسے انکار ہے کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ہم سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ ہماری قیادت سے بعض معاملات میں سہو بھی ہوا (طلوع اسلام نے ان چیزوں کو بار بار واضح کیا ہے) اس لئے کہ یہ قیادت انسانوں ہی پر مشتمل تھی اس لئے ان سے غلطیوں کا امکان تھا۔ پھر اس میں بھی کلام نہیں کہ ہماری اخلاقی حالت بہت پست ہے۔ ہم میں بڑی کمزوریاں ہیں، ایسی کمزوریاں کہ مسلمان تو ایک طرف، عام سطح کے انسانوں میں بھی وہ کمزوریاں نہیں ہونی چاہئیں۔ لیکن یاد رکھئے۔ ان کے متعلق کسی ایسے شخص یا جماعت کا بتایا ہوا علاج کبھی صحیح علاج نہیں ہو سکتا جو تشکیل پاکستان سے پہلے، پاکستان کے خلاف تھا۔ اس کے دل میں پاکستان کا درد نہیں ہو سکتا۔ وہ پاکستان کو اپنی سابقہ روش کی تکذیب کا مرجب سمجھتا ہے[1]۔

پاکستان کا مستقبل بڑا درخشندہ ہے بشرطیکہ یہ ان "ناصحین مشفق" کی کرم فرمائیوں سے محفوظ رہا جو شروع سے اس کی تخریب کے درپے رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان بے پناہ مصائب کی وجہ سے پریشان دماغ ہو رہا ہے اس لئے بعض اوقات بدنظمی اور قنوطیت کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں۔

دل بخوں مثل شفق باید زدن
دست در فتراک حق باید زدن
جاں ز امید است چوں جوئے رواں
ترک امید است مرگ جاوداں

اسی میں کامیابی کا راز ہے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب

---

[1] اس کی توبہ کو اسی صورت میں محکم اور قابل اعتماد سمجھا جا سکتا ہے جب وہ ایک عرصہ کے مسلسل عمل سے اس حقیقت کو ثابت کر دے کہ وہ فی الواقعہ دل سے تائب ہو چکا ہے اور اپنی سابقہ روش پر نادم و متاسف ہے۔